جامعہ مدنیہ لاہور کا ترجمان

علمی دینی اور اصلاحی مجلہ

انوارِ مدینہ لاہور

بیاد

عالمِ ربانی محدثِ کبیر حضرۃ مولانا سید حامد میاں رحمہ اللہ

بانی جامعہ مدنیہ

نگران

مولانا سید رشید میاں مدظلہ

مہتمم جامعہ مدنیہ، لاہور

کتب خانہ
جامعہ مدنیہ جدید
محمد آباد رائیونڈ روڈ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

ماہنامہ

انوارِ مدینہ

جلد : ۱ | ربیع الثانی ۱۴۱۳ھ ـ اکتوبر ۱۹۹۲ء | شمارہ : ۱

مدیر
سیّد محمود میاں
مُدرّس و نائب مہتمم جامعہ مدنیّہ لاہور

بدل اشتراک :

فی پرچہ ۱۰ روپے ○ زرسالانہ ۱۰۰ روپے

رابطہ کے لیے
دفتر ماہنامہ "انوارِ مدینہ" جامعہ مدنیّہ لاہور کوڈ ۵۴۰۰۰
فون ۲۰۱۰۸۶ — ۲۰۵۳۸۸

اِس شمارے میں

اداریہ		۳
ظہورِ بشارتِ عظمیٰ	مولانا سید محمد میاںؒ	۸
حضرۃ فاطمۃ الزہراءؓ	مولانا سید محمد میاںؒ	۱۷
نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم	مولانا محمود حسن گنگوہی	۲۱
اسلام میں تصورِ عبادت	ڈاکٹر محمد آصف قصوائی	۲۲
اُسوۂ حسنہ اور رفاہِ عامہ	مولانا محمد متین ہاشمی	۳۰
دارالافتاء	مولانا مفتی عبدالواحد	۳۷
مولانا قاری عبدالرشیدؒ	مولانا محمد ظہور الحق	۴۱
عیدالاضحیٰ مگر کس دنؔ	مولانا خالد محمود	۴۳
معصیت اور اسکے اثرات	مولانا ظفیر الدین	۴۸
الجامعۃ المدنیہ	مولانا عبدالمنان دہلویؒ	۵۵

سیّد رشید میاں طابع و ناشر نے شرکت پرنٹنگ پریس لاہور سے چھپوا کر
دفتر ماہنامہ انوارِ مدینہ جامعہ مدنیہ لاہور سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عالمِ ربّانی مُحدّثِ کبیر حضرۃ مولانا سیّد حامد میاں رحمہ اللہ

پاکستان کی عظیم دینی درسگاہ جامعہ مدنیہ لاہور کے بانی، مخدومنا المکرم، عارفِ کامل، شیخ الحدیث، استاذ العلماء، حضرۃ مولانا سیّد حامد میاں نور اللہ مرقدہٗ ان جلیل المرتبت علماءِ ربانی میں سے تھے جنہیں ان کی شاندار علمی و دینی خدمات و کمالات کے باعث ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

آپ برِّصغیر کے عظیم محدّث، ممتاز فقیہ، اور نامور مورخ حضرت مولانا سید محمد میاں دیوبندی رحمہ اللہ تعالیٰ کے لختِ جگر اور عالمِ اسلام کی موقر و معروف ہستی، مجاہدِ کبیر حضرۃ شیخ الاسلام مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ کے اجل خلفاء میں سے تھے۔ عزم و ہمت خُلق و مروت، سخاوت و ایثار، استغناء و خودداری، اور تقویٰ و طہارت میں اپنے شیخؒ کا مجسم نمونہ تھے۔ پاکستان میں آپ اپنے شیخ رحمہ اللہ کے جانشین سمجھے جاتے تھے اور حضرت شیخ الاسلام کے گرامی قدر صاحبزادے اور دیگر عزیز و متعلقین آپ سے والہانہ محبّت رکھتے تھے۔

قیامِ پاکستان کے کچھ ہی عرصہ بعد آپ انڈیا سے لاہور تشریف لائے اور یہاں جامعہ مدنیہ کی بنیاد رکھی۔ آپ کے اخلاص و للّٰہیت کی برکت تھی کہ جامعہ تیزی سے ترقی کی منازل طے کرتا گیا اور بہت جلد اس مقام تک رسائی پاگیا کہ بقول حضرۃ مولانا عبدالمنان دہلویؒ

عَلَی الْمَدَارِسِ قَدْ بَیَّنَتْ مُخْتَصَرًا   رَاقَتْ بِمَیْنَتِہَا فَاُقَتْ بِحِکْمَتِہَا

یہ (جامعہ مدنیہ) اپنی انفرادی خصوصیات میں دیگر مدارس پر سبقت لے گیا اور حکمت و دانش میں فوقیت پاگیا۔ میں نے مختصراً جامعہ کا حال بیان کردیا ہے۔

جامعہ مدنیہ نے اب تک ہزاروں علماء اور کثیر تعداد میں حفاظ و قراء تیار کیے ہیں۔ اس وقت بھی بفضلہ تعالیٰ جامعہ کی کفالت پر سینکڑوں طلبہ قابل اور لائق اساتذہ کی زیر نگرانی اس کی اپنی خوبصورت اور شاندار عمارت میں مختلف علوم و فنون کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔

گویا حضرۃ مخدومؒ نے ۱۳۷۵ھ میں جامعہ مدنیہ کے نام سے علم و عرفان کا جو چراغ روشن فرمایا تھا وہ بفضلہ تعالیٰ آج بھی روشن ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ روشن رہے گا اور برابر علومِ نبوۃ کی روشنی دنیا میں بکھیرتا رہے گا۔

حضرت مخدوم رحمہ اللہ عربی، اردو اور فارسی تینوں زبانوں میں غایت درجہ مہارت رکھتے تھے۔ اور تینوں زبانوں میں شعر بھی کہہ سکتے تھے۔ انگریزی بھی جانتے تھے۔

عربی ادب پر آپ کی غیر معمولی دسترس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے چوٹی کے عربی ادیب اور عربی زبان کے زیر و بم سے پوری طرح آگاہ حضرۃ العلامہ مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمہ اللہ بانی جامعہ اسلامیہ کراچی نے ماہنامہ الصدیق ملتان میں ایک دفعہ حضرۃ مخدومؒ کا عربی نعتیہ قصیدہ پڑھا تو "قدرِ جوہر شاہ داند یا بداند جوہری" اس کی فصاحت و بلاغت سے اتنے متاثر اور خوش ہوئے کہ پہلے سے کوئی رابطہ نہ ہونے کے باوجود حضرۃ بنوریؒ نے اسی قصیدے کے حوالہ سے حضرۃ مخدوم مکرمؒ سے رابطہ فرمایا۔ بعد میں یہی رابطہ، جس کا باعث یہ فصیح و بلیغ قصیدہ بنا تھا، مستقبل کے مسلسل رابطوں اور دونوں مقتدر علمی شخصیات کی باہم گہری اور لازوال مودت کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا۔

حق تعالیٰ نے "قبولِ عام" کے جس مقامِ رفیع سے حضرۃ والا کو سرفراز فرمایا تھا وہ بہت کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ آپ جامعہ مدنیہ کی چار دیواری سے باہر بہت ہی کم نکلتے۔ اکثر گوشہ نشین ہی رہتے مگر اس کے باوجود آپ حیران کن حد تک شہرت کے مالک تھے۔

عوام الناس ہی نہیں بڑے بڑے روحانی بزرگ، متبحر علماء، اصحاب سیاست و اقتدار، اہل علم و دانش، غرض زندگی کے قریب قریب ہر طبقہ سے تعلق رکھنے والے ہم وطن اور غیر ملکی اہم شخصیات اور وفود اِس روحانی، علمی، سیاسی اور یگانۂ روزگار ہستی اور اِس اعلیٰ دماغ کے مالک، روشن ضمیر، مُدبّر، دوراندیش اور عبقری انسان کی خدمت میں حاضر ہوتے اور اپنے اپنے مسائل و معاملات میں آپ سے مشورے لیتے، رہنمائی حاصل کرتے اور آپ کی مؤمنانہ فراست و بصیرت، آپ کے علم و عرفان، آپ کے تجربات اور آپ کے ذہنِ رسا اور فکرِ فلک پیما سے استفادہ کرتے۔

اِس درجہ مقبولیت، شہرت اور عروج کے باوصف ع نہد شاخِ پُرمیوہ سر بر زمین کی مانند وہ مجسمۂ انکسار و تواضع تھے۔

حضرتِ ممدوحؒ نے عجب باغ و بہار طبیعت پائی تھی۔ جب ملتے جس سے ملتے خندہ پیشانی سے ملتے۔ ایک دلکش مسکراہٹ آپ کے پُرنور، پُربہار اور باوقار چہرے پر ہر وقت رقصاں رہتی۔ آپ کے چہرے کی رونق، شگفتگی اور اس پر رقصاں ابدی تبسم گھریلو پریشانیاں اور ذاتی طویل علالت چھین سکی نہ جامعہ کی مشکلات اور جماعت (جمعیۃ علماء اسلام) کی الجھنیں اور نہ ہی ملکی اور عالمی پریشان کن واقعات اس شگفتگی و تبسم پر اثرانداز ہو سکے۔ آپ کو ہر حال میں ہنستا مسکراتا دیکھ کر ہمیں اکثر یہ شعر یاد آجاتا تھا ؎

کانٹوں میں ہے گھرا ہوا چاروں طرف سے پھول
پھر بھی کھلا ہی پڑتا ہے کیا خوش مزاج ہے

مخدومِ محترم قدس سرہٗ نے دینی علوم کی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی خاطر جو ذرائع اختیار فرمائے تھے ان میں ایک بڑا ذریعہ ماہنامہ انوارِ مدینہ کا اجراء تھا۔ یہ رسالہ آپکی زیرِ نگرانی مسلسل کئی سال شائع ہوتا رہا، جو علمی اور اصلاحی مضامین پر مشتمل ہوتا تھا۔ مگر یکایک حالات ایسے آئے کہ انوار مدینہ کی اشاعت جاری نہ رکھی جا سکی جس کا حضرتِ والا کو

بہت افسوس رہا۔ اور اس کے دوبارہ اجراء کی حسرت و آرزو آپ کے پاک دل میں برابر کروٹیں لیتی رہی۔

آپ کے بعض قریبی دوست مثلاً فاضلِ اجل، زُہدِ مجسم حضرۃ مولانا قاری شریف احمد صاحب (کراچی)، جناب الحاج ڈاکٹر سید افتخار الدین صاحب، جناب الحاج مبین احمد صاحب وغیرہم اور آپ کے بہت سے تلامذہ اور متعلقین بھی اِس سلسلۂ خیر کے رُک جانے سے خاصے آزردہ تھے۔ حضرتِ اقدسؒ کے انتقال کے بعد تو اِن حضرات کو انوارِ مدینہ کے نہ ہونے کا اور زیادہ شدّت سے احساس ہونے لگا۔ کیونکہ انوارِ مدینہ اسلامی علوم کی اشاعت کا ذریعہ ہونے کے علاوہ ان کے محبوب کی یادگار بھی تھا۔ لہٰذا ان تمام حضرات کی یہ زبردست خواہش اور کوشش رہی کہ کسی طرح اس کی اشاعت پھر سے شروع ہو۔

بفضلہ تعالیٰ مخدومِ محترمؒ کے مخلص دوستوں اور آپ کے باوفا تلامذہ و متعلقین کی دعائیں رنگ لائیں، ان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور ان کی تمنا برآئی، یعنی حضرۃ مخدومؒ کے خلفِ اکبر مولانا سیّد رشید میاں صاحب کی نگرانی اور حضرۃ کے دوسرے صاحبزادے مولانا سید محمود میاں صاحب کی ادارت میں انوارِ مدینہ کی اشاعت کا آغاز ہوگیا۔ فلہ الحمد والشکر۔

اِس دینی رسالہ کے اجراء سے یوں تو ہر سمجھدار مسلمان کو خوشی ہو رہی ہوگی مگر جن حضرات کا مخدومِ مکرمؒ سے تعلقِ خاطر تھا، آج وہ اپنے محبوبؒ کی آرزو کو ان کے ہی لائق اور اہلِ علم و ورع صاحبزادوں کے ہاتھوں پورا ہوتے دیکھ کر یقیناً دوسروں کی بہ نسبت کہیں زیادہ خوشی محسوس کر رہے ہوں گے۔

انوارِ مدینہ کی اشاعتِ نو کے اس مبارک موقعہ پر ہم حضرۃؒ والا کے تمام متعلقین اور جملہ صحیح العقیدہ مسلمانوں سے یہ کہیں گے کہ رسالہ کے آغاز کے بعد اب ہم سب کو اس کی بقاء کی فکر کرنا ہوگی۔ لہٰذا ہم میں سے ہر ایک کی یہ بھرپور کوشش ہونی چاہیئے کہ اس کارِ خیر میں تعطل نہ آنے پائے اور یہ دینی، علمی اور اصلاحی رسالہ مسلسل اور باقاعدگی

سے اپنی اشاعت کے گرانمایہ اور زریں مقاصد کی تکمیل میں سرگرمِ عمل رہے۔

انوارِ مدینہ کے مدیر، مخدوم زادۂ محترم حضرۃ مولانا سید محمود میاں صاحب اِن دنوں لاہور سے باہر ہیں۔ بنا بریں یہ بے ربط سا، مختصر، اداراتی مضمون اِس ہیچمدان (حبیب الرحمن اشرف) نے لکھا۔ حضرۃ اقدس رح کی سوانح حیات پر انوارِ مدینہ کی خصوصی اشاعت کا پروگرام بنا تو انشاء اللہ تعالیٰ اپنے مخدوم و مطاع اپنے محسن و مشفق اپنے استاذ و مربی کے متعلق مفصل مضمون لکھنے کی کوشش کروں گا۔

ہماری دُعاء ہے کہ حق تعالیٰ حضرۃ والا کو بلند تر درجات سے نوازے، انکے عظیم صدقۂ جاریہ، چشمۂ خیر و برکت، مرکزِ علومِ اسلامیہ جامعہ مدنیہ کو تا ابد قائم رکھے۔ انوارِ مدینہ کو بلا تعطل دینی خدمات بجالانے اور اس سے مسلمانوں کو مستفید ہونے کی توفیق بخشے اور حضرت مخدوم رحمہ اللہ کے اہلِ خانہ، احباب اور جملہ متعلقین کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔

وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ وصحبہ اجمعین۔

حالیہ سیلاب

(حضرت شیخ الحدیث نور اللہ مرقدہٗ کے ایک مضمون سے اقتباس جو آپ نے ۷۳ء کے سیلاب کے موقعہ پہ تحریر فرمایا تھا)

ملک میں سیلاب سے جو تباہی آئی ہوئی ہے اس پر ہر دِل غمگین اور ہر آنکھ اشکبار ہے۔ پانی کی آمد کی رفتار تیز اور جانے کی رفتار سست کہ طوفانِ نوحؑ کی ادنیٰ جھلک ہر دیدۂ عبرت کو نظر آگئی۔ یہ حال چند انچ بارش سے ہی ہوگیا کہ ہزاروں گاؤں متاثر یا تباہ ہوئے۔ فصلیں جانور اور اِنسانی جانیں ضائع ہوئیں۔

باقی صفحہ ۲۰ پر

ظہورِ بشارتِ عظمیٰ

حضرۃ شیخ الحدیث مولانا سیّد محمد میاں رحمہ اللہ کی تصنیفِ
لطیف "سیرۃ مبارکہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے چند اوراق

دُعائے خلیل و نویدِ مسیحا ہوئے پہلوئے آمنہ سے ہویدا

حضرت ابراہیم خلیل اللہ اور حضرت اسمٰعیل ذبیح اللہ علیہما الصّلوٰۃ والسّلام جب خانہ کعبہ کی تعمیر کر رہے تھے تو ان کے پاکیزہ دِلوں سے یہ دُعاء نکل رہی تھی:

"اے پروردگار! ہماری نسل میں جو قوم پیدا ہو، خداوندا ان میں ایک رسول مبعوث فرما جو خود اسی نسل کا ہو۔ جو ان کے سامنے تری آیتیں پڑھے۔ ان کو اللہ کی کتاب اور حکمت و دانش کی باتیں بتائے اور ان کو سنوارے۔" (سورۃ بقرہ۔آیت ۱۲۹)

وقت —— دن —— تاریخ

حضرت عیسٰی علیہ السّلام نے جو بشارت دی تھی "یَأْتِی مِنْ بَعْدِی اسْمُہٗ اَحْمَدُ" میرے بعد ایک رسول آئے گا جس کا نام احمد ہوگا۔

۲۵ر اپریل ۵۷۱ء کو اس جان آفریں بشارت کا ظہور ہوا۔

صبح کا سُہانا وقت تھا۔ ابھی سُورج نہیں نکلا تھا کہ ہدایت و رحمت کا یہ آفتاب افقِ مکّہ پر طلوع ہوا۔ ربیع الاوّل کی بارہ[1] تھی۔

---

[1] مشہور یہی ہے ھذا ھو المشھور عند الجمھور (البدایۃ والنہایہ ص ۲۶۰/۲) مگر مؤرخین نے ۱۲ کے علاوہ اور تاریخیں بھی بیان کی ہیں۔ فلکیات کے ماہر علامہ محمود فلکی نے ۹ ربیع الاوّل صحیح قرار دی ہے۔ حضرت الاستاذ العلام المحدث مولانا سید انور شاہ کشمیری رحمہٗ اللہ ان کے علاوہ علامہ شبلی رحمہ اللہ نے بھی علامہ محمود فلکی کی تحقیق کو تسلیم کیا ہے یعنی ۹ ربیع الاوّل ۲۱ر اپریل ۵۷۱ء۔

شرافت اور انسانیت کے چمن میں آپ کی تشریف آوری
فصلِ گل کی آمد تھی تو آپ کی پیدائش بھی موسم بہار میں ہوئی

نامِ نامی | اس چہیتے بچّہ کا نام دادا نے "مُحمّد" والدہ نے "احمد" رکھا۔[1] باپ (عبداللہ) کا انتقال دو مہینے پہلے[2] ہو چکا تھا۔ ماں کا نام آمنہ[3] تھا۔ اور دادا کا نام عبدالمطلب[4]۔ جو قریش کے سردار اور مکہ کے بڑے لوگوں میں سے تھے۔

---

[1] روایت ہے کہ یہ نام اُن کے سوچے ہُوئے نہیں تھے بلکہ دادا اور ماں کو ان ناموں کی بشارت خواب میں ہوئی تھی (سیرۃ ابن ہشام، خصائص کبریٰ وغیرہما)

[2] تجارتی قافلہ میں شام گئے تھے غلہ لینے کیلئے۔ واپسی میں جب قافلہ مدینہ پہنچا تو عبداللہ بیمار ہو گئے مدینہ کے مشہور قبیلہ بنی عدی بن نجار سے نانہالی رشتہ تھا۔ عبداللہ یہیں ٹھہر گئے قافلہ والوں نے مکہ پہنچ کر خواجہ عبدالمطلب کو عبداللہ کی بیماری کی خبر دی۔ عبدالمطلب نے اپنے بڑے لڑکے "حارث" کو مدینہ بھیجا، مگر عبداللہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ دارالنابغہ میں ان کو دفن کیا گیا۔ پچیس سال عمر ہوئی۔ ترکہ میں بکریوں کا ایک گلہ۔ پانچ اونٹ اور ایک باندی "اُم ایمن" چھوڑی (طبقات ابن سعد ص ۶۱۔ ج ۱) [3] آمنہ کے باپ کا نام وہب تھا پسر عبد مناف پسر زہرہ پسر کلاب پسر مرہ۔ کلاب پر مادری اور پدری دونوں سلسلے جمع ہو جاتے ہیں۔

لطیفہ۔ آمنہ کے چچا کا نام وُہیب تھا وہ انہیں کے یہاں رہتی تھیں۔ خواجہ عبدالمطلب وہیب کے پاس گئے اور عبداللہ کی شادی کا پیغام دیا۔ انہوں نے منظور کیا اور عقد ہو گیا۔ اسی موقع پر خواجہ عبدالمطلب نے بھی وہیب کی صاحبزادی سے جن کا نام ہالہ تھا اپنا پیغام دیا اور شادی کر لی۔ حضرت حمزہؓ انہی ہالہ کے بطن سے ہیں۔ ہالہ رشتہ سے آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خالہ ہُوئیں۔ اس بناء پر حضرت حمزہؓ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خالہ زاد بھائی بھی ہُوئے اور چچا بھی (ابن سعد ص ۵۸ ج ۱)

[4] عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مُرّہ بن کعب بن لُوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار۔ یہ سلسلۂ نسب خود آنحضرتؐ نے ایک تقریر میں بر سرِ منبر ارشاد فرمایا تھا۔ البدایہ والنہایہ ص ۲ ج ۲۔ اس کے بعد کا سلسلہ واضح نہیں ہے

(دُودھ پلانے والی مامائیں)

زعم برتری اور خوش حالی کا ایک تکلف یہ تھا کہ بیگمات اپنے بچّوں کو خود دودھ نہیں پلاتی تھیں۔ کچھ عرصہ بچّہ ماں کے پاس رہتا تو دُودھ پلانے میں خاندان کی عورتیں یا باندیاں مدد کیا کرتی تھیں۔ پھر بچّہ کو مستقل طور پر کسی ماما کے سپرد کردیا جاتا تھا۔

قریش کو اپنی زبان سے عشق تھا۔ وہ شخص قوم کا سردار نہیں مانا جاسکتا تھا جو فصیح نہ ہو۔ بچپن ہی سے زبان کی حفاظت کی جاتی تھی اور بچّوں کو فصیح عربی کا عادی بنایا جاتا تھا۔ مکّہ شہر میں یہ ممکن نہیں تھا کہ بچّے ٹکسالی فصیح عربی کے عادی ہوں۔ کیونکہ یہ ایک تیرتھ تھا جہاں غیر قریشی عرب جو فصاحت سے ناآشنا ہوتے تھے، ہمیشہ آتے رہتے تھے۔ یہاں قیام کرتے تھے۔ تجارت کے سلسلہ میں بھی آمد و رفت رہتی تھی اور زبان کے لحاظ سے سب سے زیادہ خطرناک بات یہ تھی کہ

اسی لیے علماء نے اس کو نقل کرنا بھی پسند نہیں کیا۔ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ کے سامنے کسی نے حضرت آدم علیہ السّلام تک سلسلہ بیان کیا، مگر حضرت مالک رحمہ اللہ نے اس کا ثبوت طلب کیا تو جواب کچھ نہیں تھا۔ اسی طرح حضرت اسمٰعیل علیہ السّلام تک سلسلہ نسب کے متعلق بھی آپ نے ناپسندیدگی ظاہر کی کہ کوئی قابلِ اعتماد ثبوت نہیں ہے، البتہ عدنان تک سلسلہ نسب کو صحیح کہا جاتا ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے سامنے عدنان سے آگے سلسلہ نسب بیان کیا جاتا تو فرماتے "کذب النسابون" (نسب بیان کرنے والے غلط کہتے ہیں) ان کی غلط بیانی کے متعلق حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے استدلال کیا۔ والذین من بعدھم لا یعلمھم الا اللہ (سورہ ابراہیم آیت ۹) یعنی جب اللہ تعالیٰ اس آیت میں یہ فرماتے ہیں کہ قوم نوح و عاد و ثمود اور جو ان کے بعد قومیں گذریں ان کو صرف اللہ ہی جانتا ہے تو اب ان ادوار اور قوموں کے متعلق ماہرین انساب کا دعویٰ واقفیت یقیناً غلط ہے۔

یہاں عجمی (شام اور افریقہ وغیرہ کے غلام) بکثرت رہتے تھے ایک ایک گھرانے میں کئی کئی غلام ہوتے تھے۔ ان کی مخلوط عربی مضحکہ خیز ہوتی تھی اور بچوں کا واسطہ زیادہ تر انہیں غلاموں سے پڑتا تھا اس لئے قریش نے کچھ ایسے دیہاتی قبائل منتخب کر رکھے تھے جن کی زبان فصیح مانی جاتی تھی۔ انہیں قبائل کی عورتوں کو وہ اپنے بچوں کی "ماما" بناتے تھے۔ ان قبائل کی عورتیں مکہ میں آتیں اور بچوں کو لیجاتیں وہی دودھ پلاتیں اور وہی پرورش کرتیں۔ انہیں کی ٹکسالی عربی کے الفاظ بچوں کے کانوں میں پڑتے انہیں الفاظ کی ادائیگی کیلئے بچوں کی زبان پہلی مرتبہ پلٹتی اور فصاحت گویا ان کی گھٹی[1] میں پڑ جاتی۔ زبان کی حفاظت کے علاوہ صحت کے لحاظ سے بھی دیہات کی کھلی ہوا بچوں کے لیے مفید ہوتی تھی۔ اس سماجی رسم کا ایک محرک یہ بھی تھا کہ بچوں کا نشو و نما صحت مندانہ ہو[2] اخلاق و خصائل کے لحاظ سے بھی یہ قبیلے پست[3] نہیں تھے۔ یتیم عبداللہ کے دورِ رضاعت کو خاندانی آداب کے اسی سانچہ میں ڈھلنا پڑا، چنانچہ آپ کی والدہ نے تو صرف سات یا نو روز دودھ پلایا۔ پھر ابولہب[4] کی آزاد کردہ باندی ثویبہ نے سات ماہ دودھ پلایا۔ ان کے علاوہ کچھ اور خواتین کے

---

[1] آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم فخریہ فرمایا کرتے تھے انا اعربکم انا قرشی و استرضعت فی بنی سعد بن بکر۔ سیرۃ ابن ہشام ص ۱۰۴ ج ۱۔ میں تم میں سب سے زیادہ خالص صحیح اور شستہ عربی بولنے والا ہوں۔ میں قریشی ہوں (جن کی زبان ٹکسالی ہوتی ہے) اور قبیلہ بنی سعد بن بکر میں میں نے دودھ پیا ہے (جو فصاحت زبان میں مقامِ اعلیٰ کا مالک ہے) ابنِ سعد کے الفاظ یہ ہیں لسانی لسان بنی سعد بن بکر (طبقات ج ۱۔ص ۷) [2] ماخوذ از سیرۃ ابنِ ہشام ص ۱۰۱ ج ۱۔ سیرۃ حلبیہ ص ۹۶ ج ۱

[3] قبیلہ سعد جس سے حضرت حلیمہ اور اُن کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کا تعلق تھا۔ ثقیف کی ایک شاخ ہے جو بہادری شجاعت اور تیر اندازی میں مشہور تھا۔ اور شرافت میں قریش کے ہم پلّہ مانا جاتا تھا، چنانچہ قریش سے اس کی رشتہ داریاں بھی تھیں [4] ابولہب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سوتیلے چچا۔ اصل نام عبدالعزیٰ تھا مگر چونکہ سُرخ سپید رخسار انگارے کی طرح رہتے تھے۔ اس لیے ابولہب کنیت اختیار کی۔ (خصائص و سیرۃ ابن ہشام وغیرہ) اپنی تعریف مقصود تھی کہ انگارہ کی طرح چمکدار اور روشن۔ اتفاق

نام بھی لیے جاتے ہیں جنہوں نے دُودھ پلایا[1]۔ اس کے بعد آپؐ حضرت حلیمہؓ کے سپرد کیے گئے جو آپؐ کو قبیلہ بنی سعد میں لے گئیں۔ کم و بیش چار سال آپؐ نے اسی قبیلہ میں گزارے۔

یتیم بچّہ اور کمزور ماما

جیسا کہ رواج تھا۔ دیہات کی عورتیں دُودھ پینے والے بچّوں کو لینے کے لیے مکّہ میں آئیں مگر یتیم عبداللہ کو کسی نے قبول نہیں کیا کہ "بیوہ ماں" سے کچھ زیادہ انعام کی اُمید نہیں

سے یہ تعریف مذمت بن گئی۔ کیونکہ حسین اور روشن رخسار کے بجائے "ابولہب" دوزخی کو کہا جانے لگا (معاذاللہ) ابولہب کی باندی ثویبہ نے جب گوشہ جگر عبداللہ کی ولادت کی خبر سُنائی تو ابولہب نے اس خوشی میں اس باندی کو آزاد کر دیا۔ احادیث میں ہے کہ اس کارِ خیر کی وجہ سے ابولہب کے عذاب میں دوشنبہ کے روز تخفیف کر دی جاتی ہے (البدایہ والنہایہ ص ۲۷۳ ج ۲) ۔ ثویبہ کچھ عرصہ پہلے حضرت حمزہؓ کو بھی دُودھ پلا چکی تھیں جنہوں نے اسلام میں سید الشہداء کا خطاب پایا۔ یہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے چھوٹے چچا تھے اور ثویبہ کے رشتے سے دُودھ شریک (رضاعی) بھائی بھی ہو گئے تھے۔ آنحضرتؐ کو دودھ پلانے کے بعد ابوسلمہ کو دُودھ پلایا۔ یہ آنحضرتؐ کی پھوپھی برہ کے فرزند ارجمند تھے۔ یعنی پھوپھی زاد بھائی پہلے سے تھے۔ اب دُودھ شریک بھائی بھی ہو گئے۔ اسلام سے مشرف ہُوئے۔ ہجرت کے بعد مدینہ طیبہ میں وفات ہوئی۔ اکمال فی اسماء الرجال و بخاری شریف ص ۷۵۰ وغیرہما) ثویبہ کا لڑکا جس نے آنحضرتؐ کے ساتھ دودھ پیا اس کا نام مسروح تھا۔ ثویبہ کے اسلام میں علماء کا اختلاف ہے۔ حافظ ابومندہ نے ثویبہ کو صحابیات میں ذکر کیا ہے۔ ثویبہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوتیں۔ آنحضرتؐ ان کی کچھ خدمت کرتے ہجرت کے بعد بھی آنحضرتؐ ثویبہ کے لیے ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ فتح خیبر کے بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا اور اُن کے لڑکے مسروح کا بھی۔ فتح الباری ص ۱۱۸ ج ۹۔ [1] تین لڑکیاں قبیلہ بنی سلیم کی تھیں جن میں سے ایک کا نام عاتکہ تھا۔ ایک خاتون کا نام اُم فروہ تھا۔ ام ایمن کا نام بھی لیا جاتا ہے (سیرۃ حلبیہ ص ۹۵ ج ۱)

تھی۔ دادا اگرچہ سردار مکّہ تھے مگر چراغِ سحر تھے۔ قبیلہ سعد کی ایک عورت حلیمہ تھی وہ بھی "ماما" بننے کیلئے آئی تھی۔ مگر اس کو عورتوں نے اس لیے منظور نہ کیا کہ وہ فاقہ زدہ کمزور تھی۔ وہ خیال کرتی تھیں کہ یہ سوکھی عورت خود دُودھ کی محتاج ہے۔ بچّہ کو دُودھ کیا پلائے گی۔ مگر نامرادی مراد بن گئی۔ جب حلیمہ سعدیہ سیّدہ آمنہ کے پاس پہنچیں اور آمنہ کا لال اسے دُودھ پلانے کیلئے مل گیا۔ حلیمہ کو شغل ہاتھ لگا اور آمنہ کی اپنی پڑوسنوں اور سہیلیوں میں آنکھ نیچی نہ ہُوئی ورنہ انہیں صدمہ تھا کہ عورتیں کہیں گی کہ اس یتیم کو کوئی "ماما" بھی نصیب نہ ہُوئی۔

بھاگوان بچّے کی برکت

قدرت کا یہ حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ جیسے ہی حلیمہ کی گود اس یتیم موتی سے آراستہ ہُوئی اس پر برکتوں کا مینہ برسنے لگا پہلے اس سوکھی فاقہ زدہ عورت کے دُودھ سے اس کے بچّے کا پیٹ بھی نہیں بھرتا تھا۔ اب دونوں شکم سیر ہونے لگے۔ گھر کی بکریوں کے تھنوں میں بھی دُودھ بڑھ گیا اور وہ گدھی جس پر حلیمہ سوار ہو کر آئی تھیں پہلے مَٹھی اور مَریل اور جب واپس ہُوئی تو سب سے آگے آگے چل رہی تھی جیسے کسی پیاسے نے پانی دیکھ لیا ہو۔ بارش نہیں ہوتی تھی جنگل سُوکھ رہے تھے گاؤں کی بکریاں بھُوکی آتی تھیں مگر حلیمہ کی بکریاں شام کو گھر آتیں تو کوکھیں تنی ہُوئی تھیں اور تھن لٹکے ہُوئے۔

حلیمہ کو حیرت

حلیمہ کا اپنا بچّہ بچّوں کی طرح دُودھ پیتا تھا مگر یہ یتیم بچّہ صرف دہنا دُودھ پیتا تھا۔ بائیں کو لب بھی نہ لگاتا تھا۔ حلیمہ بایاں دُودھ دیتیں تو اپنا منہ ہٹا لیتا[1] تھا۔ حلیمہ کو اس پر حیرت ہوتی، مگر اس کو کیا خبر تھی کہ یہ بچّہ بڑا ہو گا تو قناعت کا معلّم عدل و انصاف کا پیکر اور مساوات کا سب سے بڑا علمبردار ہو گا۔

یہ بچّہ کچھ اور بڑا ہُوا۔ نوالہ لینے لگا تو اس کی مرضی ہوتی تھی کہ جو اس کو ملے وہ اس کے دُودھ شریک کو بھی ملے۔ بچّے روتے ہیں کہ کوئی چیز دوسرے بچّے کو کیوں دی اور یہ بچّہ اس پر روتا تھا

---

[1] فیابی ان یشرب منہ۔ ذکرہ ابن سبع فی الخصائص
خصائص کبریٰ (ص ۵۹۔ جلد ۱)

کہ جو چیز اس کو ملی وہ اس کی بہن کو کیوں نہیں ملی۔ اسی لیے آپ کے رضاعی چچا ابوثروان نے کہا تھا:

میں نے آپؐ کا ہر دور دیکھا ہے اور ہر دور میں آپؐ کو سب سے بہتر پایا۔
زمانہ شیر خوارگی میں سب سے بہتر شیر خوار۔ دودھ چھوٹا تو سب سے بہتر فطیم[1]
جوان ہوئے تو سب سے زیادہ صالح نوجوان۔ آپؐ کے اندر خیر کی خصلتیں کوٹ کوٹ کر بھر دی گئی ہیں۔

عجیب و غریب واقعہ اور حلیمہ کی پریشانی

چار سال ہو گئے یہ معصوم بچّہ حلیمہ کے کلیجہ کو ٹھنڈک اور گھر کو رونق بخش رہا ہے۔ لیکن اب ماں کی ممتا چاہتی ہے کہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اپنے پاس رکھے۔ یہی بیوہ کی زندگی کا آسرا تھا اور اسی کی خاطر وہ اپنی جوانی تج رہی تھی۔ اس گھر کو چھوڑ کر کسی دوسرے کا گھر آباد کرنے کا خیال بھی نہیں کیا تھا، حالانکہ عرب کے دستور کے مطابق یہ عیب کی بات نہیں تھی۔

مگر حلیمہ اور اس کے شوہر حارث بن عبدالعزیٰ کو اس بچّہ سے اتنی محبت ہو گئی تھی کہ جُدا کرنا ان کو گوارا نہیں تھا، لیکن جب ماں اور دادے کا تقاضہ زیادہ ہوا تو چار و ناچار یہ دونوں اپنے گھر کے اس چراغ کو لے کر عبدالمطلب کے یہاں پہنچے، لیکن اتفاق ایسا ہوا کہ انہیں دنوں میں مکہ میں وبا پھوٹ پڑی۔ بس حلیمہ کو بہانہ مل گیا۔ وہ بچّہ کو واپس لے آئیں کہ جب مکہ کی آب و ہوا ٹھیک ہو جائے گی تب پہنچا دیں گی۔

شقِ صدرِ مبارک

دُلارا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پھر اسی طرح حلیمہ کے یہاں رہنے لگا۔ حلیمہ کے سب[2] بچّے اس کا خیال رکھتے تھے۔ اس سے محبت

---

[1] دودھ پینے والے بچّے کو رضیع یا مرضع کہتے ہیں اور دودھ چھوٹ جائے تو فطیم کہتے ہیں۔

[2] حضرت حلیمہ کے اپنے بچّے تین تھے۔ ایک لڑکا عبداللہ بن حارث اور دو لڑکیاں انیسہ اور حذافہ۔ حذافہ کو شیماء بھی کہتے تھے اور حلیمہ کہیں چلی جاتی تھیں تو شیماء ہی حضرت محمد کو ساتھ رکھا کرتی تھیں۔

کرتے تھے اور کہیں اکیلا نہیں چھوڑتے تھے۔

ایک روز گھر سے باہر یہ سب بچے کھیل رہے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ دو آدمی آئے یہ بڑے حسین و جمیل خوبصورت اور شاندار آدمی تھے۔ نہایت عمدہ صاف لباس پہنے ہوئے۔ انہوں نے بچّے (محمد صلّی اللہ علیہ وسلّم) کو اُٹھایا اور اس کو الگ لے گئے۔ بچّے دوڑے ہوئے گھر پہنچے وہاں سے حلیمہ اور ان کے شوہر دوڑے ہوئے آئے۔ دیکھا "محمدؐ" اپنی جگہ موجود ہیں اور کوئی آدمی وہاں موجود نہیں ہے۔ "محمدؐ" خوش و خرم ہیں۔ مسکرا رہے ہیں۔ البتہ چہرے پر کچھ اثر ہے۔ اُن سے پوچھا، بیٹا کیا ہوا۔ کون آدمی تھے۔ وہ تمہیں کیوں اُٹھا لائے تھے۔ وہ کہاں چلے گئے۔

معصوم بچّہ نے پھوکی پھوکی زبان سے سارا قصّہ سُنا دیا کہ ان دونوں نے مجھے لٹا کر یہاں سے یہاں تک (سینہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) چاک کیا۔ پھر گوشت کا ایک لوتھڑا (دِل) نکالا۔ اُس کو چیر کر سیاہ دانہ اس میں سے نکالا۔ برف اُن کے پاس تھا اُس سے دھویا۔ پھر اس کو اپنی جگہ رکھ دیا اور ٹھیک کر کے چلے گئے۔ مجھے تکلیف کچھ نہیں ہوئی۔ بلکہ ٹھنڈک سی معلوم ہوئی اور اب تک معلوم ہو رہی ہے۔

حلیمہ اور حارث نے بچّہ کو چمکارا۔ پیار کیا۔ سینہ سے لگا کر گھر لے آئے۔

حلیمہ اور اُن کے شوہر نے دیکھا وہاں کچھ نہیں تھا، البتہ محمد (صلّی اللہ علیہ وسلم) اور دوسرے بچّوں سے جو سُنا تھا اس پر اُن کا خیال یہ ہُوا کہ ہو نہ ہو یہ جنّات کا اثر ہے اور یہ دونوں آنے والے جنّ تھے۔ عرب جنّات کو مانتے تھے اور ایسی باتوں کو جنّات کی حرکت سمجھا کرتے تھے، لیکن ان دونوں کو خیال رہنے لگا کہ آج یہ ہوا ہے کل کو خدا جانے کیا ہو جائے کچھ دن اسی سوچ و چار میں گزرے۔ اس واقعہ کا چرچا ہوا تو کچھ پڑوسیوں نے حلیمہ اور حارث کو مشورہ دیا کہ کسی کاہن یا کسی یہودی یا عیسائی عالم کے پاس لے کر بچّہ کو دکھائیں اور پوچھیں یہ کیا بات ہے، چنانچہ ایک یہودی عالم کے پاس لے گئے مگر وہاں پہنچ کر جو واقعہ ہوا اس سے ان کی پریشانی اور بڑھ گئی۔

جس یہودی کے پاس لے گئی تھیں اُس نے بچّہ کو دیکھنے کے بعد شور مچانا شروع کر دیا۔ یہی بچہ ہے جو عرب میں انقلاب برپا کرے گا اس وقت کے مذہبوں کو ختم کر دے گا۔ پوجا پاٹ بند اور مورتیوں کا کھنڈن کرے گا۔ اے لوگو! اپنا مذہب بچانا چاہتے ہو تو اس بچّہ کو ختم کر دو۔

یہودی عالم کی یہ حرکت دیکھ کر حارث اور حلیمہ اور بھی گھبرا گئے۔ فوراً بچّہ کو اٹھایا۔ نظروں سے بچا کر گھر لائے اور طے کر لیا کہ بچّہ کو خیریت کے ساتھ اس کی ماں اور دادے کے پاس پہنچا دیں.... آمنہ سمجھے ہوئے تھیں کہ "حلیمہ" بچّہ کو اپنے شوق سے لے گئی ہیں تو جب تک میں اصرار اور تقاضہ نہیں کروں گی وہ واپس نہیں لائیں گی، لیکن اچانک ایک روز دیکھا کہ حلیمہ بچّہ کو لیے آرہی ہیں۔ آمنہ کو حیرت ہوئی۔ حلیمہ سے اس طرح اچانک لے آنے کی وجہ دریافت کی۔ حلیمہ نے سارا قصّہ سُنایا اور جو اُن کا خیال تھا وہ بھی بتا دیا کہ شاید بچّہ پر کسی جنّ کی نظر ہے مگر حلیمہ کو حیرت ہُوئی کہ آمنہ اس قصّہ کو سُن کر پریشان نہیں ہُوئیں انہوں نے بچّہ کو گلے لگایا اور حلیمہ کو جواب دیا کہ تمہارا خیال غلط ہے۔ میرا یہ پھُول جس کے چہرے پر نُور کھِل رہا ہے اس پر جنّات کا اثر نہیں ہو سکتا۔ یہ برکتوں والا بچّہ ہے اس کے سر پر رحمتِ خدا کا سایہ ہے۔ مَیں رحمت کے آثار شروع سے دیکھتی رہی ہوں مجھے طرح طرح کے انوار نظر آتے رہے ہیں۔ جنّات کے اثر سے دِل پر دہشت اور دماغ میں وحشت ہوتی ہے مگر مجھے جو آثار[1] نظر آئے اُن سے ہمیشہ دل کو سکون اور طبیعت کو بشاشت اور فرحت ہوئی ہے۔ بچّہ کے چہرے پر بھی رونق ہے نور چمک رہا ہے۔ جنّات کے اثر سے چہرہ مرجھا جاتا ہے اور بیماروں جیسی صورت ہو جاتی ہے۔ یہ تمہاری مہربانی ہے کہ بچّہ کو لے آئیں۔ میرے دل کی مُراد پُوری ہوئی۔ خدا تمہیں خوش رکھے۔ آمنہ نے حلیمہ کو رخصت کیا اور دادا عبدالمطلب نے اس کو خوش کر کے واپس کیا۔

---

[1] مثلاً یہ کہ زمانۂ حمل میں طبیعت ہلکی پھُلکی رہی، حتیٰ کہ مجھے احساس بھی نہیں ہُوا۔ مجھے خواب میں بتایا گیا کہ تم حاملہ ہو اور جو بچّہ پیدا ہو گا وہ اُمت کا سردار اور نبی ہو گا۔ ابن سعد ج ۱ ص ۶۰ پہلے خواب میں دیکھا کہ ایک نور میرے اندر سے نکلا جس سے شام کے محل روشن ہو گئے۔ خصائص کبریٰ

مولای صل وسلم دائما ابدا علی حبیبک خیر الخلق کلهم

سیدۃ النساء فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا

درس حدیث

استاذ العلماء شیخ الحدیث حضرۃ مولانا سیّد حامد میاں رحمہ اللہ کے زیرِ اہتمام ہر اتوار کو نمازِ مغرب کے بعد جامعہ مدنیہ میں "مجلسِ ذکر" منعقد ہوتی تھی۔ ذکر سے فارغ ہو کر حضرت رحمہ اللہ حدیث شریف کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ ذکر و بیان کی یہ مبارک اور روح پرور محفل کس قدر جاذب و پُرکشش ہوتی تھی الفاظ اس کی تعبیر سے قاصر ہیں۔

محترم الحاج محمود احمد عارفؒ کی خواہش و فرمائش پر عزیز بھائی شاہد صاحب سلمہٗ نے حضرۃ شیخ الحدیث قدس سرہٗ کے بہت سے دروس ٹیپ ریکارڈر کے ذریعہ محفوظ کر لیے تھے اور پھر دروس والی تمام کیسٹیں انہوں نے ادارہ انوارِ مدینہ کو عطا کر دیں۔

ہماری دُعاء ہے کہ جن کی مہربانی، توجہ اور سعی سے یہ انمول علمی جواہر ریزے ہمارے ہاتھ لگے، حق تعالیٰ ان سب کو بیش از بیش اجر سے نوازے۔ ہم انشاء اللہ تعالیٰ یہ قیمتی لؤلؤ و لالا انوارِ مدینہ کے ذریعہ حضرۃ رحمہ اللہ کے مریدین و احباب تک قسط وار پہنچاتے رہیں گے۔

واضح رہے کہ حضرۃ کے خلفِ اکبر اور جانشین حضرۃ مولانا سیّد رشید میاں صاحب کے زیرِ اہتمام ذکر و درس کا یہ سلسلہ بفضلہ تعالیٰ اَب بھی جاری ہے۔

ہنوز آں ابرِ رحمت در فشان است　　خم و خمخانہ با مہر و نشان است

اور انشاء اللہ جاری رہے گا۔

چاہا خدا نے تو تری محفل کا ہر چراغ　　یونہی جلا کرے گا بجھایا نہ جائے گا

حضرت مسور ابن مخرمہؓ ایک صحابی ہیں وہ بتاتے ہیں کہ حضرت علیؓ سے ابوجہل کی بیٹی کا رشتہ ہونے لگا تھا۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو پسند نہیں فرمایا اور

یہ بھی فرما دیا کہ مَیں حلال کو حرام، حرام کو حلال نہیں کرتا یعنی یہ مَیں نہیں کہتا کہ علیؓ کے لئے دوسری شادی منع ہے، حرام ہے۔ لیکن یہ کہ بنتِ رسول اللہ (رسول اللہ کی بیٹی) اور بنت عدوّ اللہ (اللہ کے دشمن ابوجہل کی بیٹی) دونوں کو جمع کیا جائے ٹھیک نہیں۔ علیؓ اگر اُس سے نکاح کرنا چاہتے ہیں تو فاطمہؓ کو چھوڑ دیں۔ اور (دونوں کے جمع کرنے کو پسند نہ فرمانے کی) ایک وجہ بھی ارشاد فرمادی کہ فاطمۃ بضعۃ منی یعنی فاطمہ میرے جسم کا ایک حصّہ ہے۔ فمن اغضبھا اغضبنی جو اسے خفا کرے گا۔ وہ مجھے بھی غصّہ دلائے گا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ

جو چیز فاطمہ کو بُری لگے گی مجھے بھی بُری لگے گی اور جس چیز سے اس کو اذیّت پہنچے گی اس چیز سے مجھے بھی اذیت پہنچے گی۔

ایک بڑی وجہ (دونوں کے جمع کرنے کو ناپسند فرمانے کی) یہ تھی کہ جہاں بھی دو عورتیں جمع ہوتی ہیں وہاں کچھ نہ کچھ خفگی پیدا ہو ہی جاتی ہے۔ ابوجہل کی بیٹی فتح مکہ کے بعد نئی نئی مُسلمان ہوئی تھی اور فتح مکّہ تک انہوں نے اپنے ماحول میں جو کچھ سُنا تھا وہ اسلام اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے خلاف تھا اور وہ ان کا باپ ابوجہل ہی تو تھا جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے مقابلہ پر لشکر لے گیا تھا۔ تو جس کا باپ اسلام اور مُسلمانوں کا بدترین دشمن رہا ہو اور پھر وہ مسلمانوں کے ہاتھوں قتل بھی ہُوا ہو وہ سوکن بن رہی ہو رسول اللہ کی بیٹی کی تو ان سے صحیح معاملہ رکھنے کے بارے میں بھرپور اطمینان نہیں کیا جا سکتا تھا اور آقائے نامدار علیہ الصلوٰۃ والسلام کو یہی خدشہ تھا کہ فاطمہؓ تو زیادتی نہیں کریں گی مگر کیا وہ بھی زیادتی نہیں کریں گی؟ اس بارے میں (شاید) آپؐ کو اطمینان نہیں تھا، کیونکہ وہ ابھی تک اس مقام کو نہیں پہنچی تھیں جو اسلام لانے، اعمال صالحہ بجا لانے اور دِل میں اسلام رچنے کے بعد حالت ہوتی ہے۔ جو نیا نیا اسلام میں داخل ہوتا ہے وہ تو پورے مسئلے بھی نہیں سمجھتا۔ اُس کے جذبات بھی ابھی نہیں بنے ہوتے، اس لیے خدشہ تھا کہ وہ سوکن بننے کے بعد معاملہ کو صحیح نہ رکھ سکیں گی نتیجہ یہ ہوگا کہ فاطمہ خفا ہوں گی، فاطمہ کو تکلیف ہوگی اور مجھے (یعنی آنحضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام) کو پتہ چلے گا تو پھر میری طبیعت پر بھی بوجھ

ہوگا اور یوں ابوجہل کی بیٹی کے ساتھ ساتھ ہو سکتا ہے علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سے بھی ذہن میں دل میں دُوری پیدا ہو جائے اور یہ ہر مُسلمان جانتا ہے کہ جس کے بارے میں جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے دِل میں دُوری آجاتی ہے وہ اس شخص کے لیے بڑا نقصان دہ ہوتا ہے جس کا اثر ایمان پر پڑتا ہے۔ ایمان یا تو کمزور ہوتا ہے یا سِرے سے رہتا ہی نہیں اور آخرت برباد ہو جاتی ہے (جس درجہ کی دُوری ہوتی ہے اُس درجہ کا اثر پڑتا ہے) تو آپ اُس نومسلمہ (بنت ابی جہل) بلکہ خود علی مرتضیٰ کو اِس نقصان سے بچانا چاہتے تھے اِس لیے آپ نے فرمایا لا تجتمع بنت رسول اللہ وبنت عدو اللہ' دونوں کے جمع کرنے کو منع فرما دیا۔

جناب آقائے نامدار صلّی اللہ علیہ وسلّم کو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے متعلق یہ پورا انداز تھا کہ وہ غلط کام نہیں کر سکتیں اور کسی پر زیادتی نہیں کر سکتیں۔ اگر فاطمہؓ کے مزاج میں تیزی ہوتی یا وہ کسی سے بے وجہ خفا ہونے والی ہوتیں یا خود غلطی پر ہوتے ہُوئے دوسروں پر غصہ ہوتیں تو آنحضرۃ صلّی اللہ علیہ وسلّم یہ ارشاد نہ فرماتے کہ فمن اغضبھا اغضبنی (جو اسے خفا کرے گا وہ مجھے بھی غصّہ دلائے گا) کیونکہ یہ نہیں ہو سکتا کہ حضورؐ یہ فرمائیں کہ فاطمہ غلط طور پر بھی اگر خفا ہوں گی تو مَیں خفا ہو جاؤں گا۔ آپ جانتے تھے اور آپ کا انداز تھا کہ فاطمہؓ جب خفا ہوں گی ان کا خفا ہونا درست ہوگا۔

حقیقت یہ ہے کہ حضرۃ فاطمہؓ کی طبیعت بیحد صاف، سنجیدہ، عادلانہ اور دُنیوی خرابیوں سے پاک تھی۔ اپنی سوتیلی ماؤں کے ساتھ بھی ان کا سلوک ہمیشہ بہت اچھا رہا اور کسی سوتیلی والدہ کو کبھی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ اور ان سب کے ساتھ ان کے تعلقات نہایت درجہ خوشگوار رہے۔

حضرت عائشہ صدیقہؓ حضرت فاطمہؓ کے متعلق فرماتی ہیں ما تخفی مشیتھا من مشیۃ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم یعنی حضرت فاطمہؓ کی چال ایسی تھی جو واضح طرح جناب رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی چال کے مشابہ تھی۔ تو ایسی باتیں وہی ذکر کر سکتا ہے جسے صحیح تعلق ہو، قلبی تعلق ہو۔ دِل میں بُرائی ہوتی ہے تو اچھی چیزوں کو چھُپا لیا جاتا ہے۔

توحضرت فاطمۃ الزہراؓ نے کبھی ایسا موقع ہی نہیں دیا تھا اپنی ماؤں کو کہ انہیں شکایت ہو۔ غرض حضرۃ فاطمہؓ نہایت اعلیٰ مزاج اور صاف طبیعت کی مالک تھیں، اس لیے آقائے نامدار نے یہ فرمایا کہ فاطمہ بضعۃ منی فمن اغضبھا اغضبنی (فاطمہ میرے جسم کا حصّہ ہے جو اسے غصّہ دلائے گا وہ مجھے غصہ دلائے گا) اور اس لیے حضرت علیؓ کے لیے یہ پسند نہ فرمایا کہ فاطمہؓ کی موجودگی میں ابوجہل کی بیٹی سے نکاح کریں، کیونکہ اس رشتہ میں علیؓ کے لیے بڑے نقصان کا اندیشہ تھا۔ حضرت علیؓ نے آپؐ کے منشاء کے مطابق رشتہ کا ارادہ ترک فرمادیا۔

بقیہ : حالیہ سیلاب

ہم نے اسلام کا نام لے کر یہ ملک لیا۔ اس میں سب کچھ ہوا مگر اسلام ہی نہ ہوا۔ گویا خدا سے بدعہدی کی۔ سود، شراب، بداخلاقی ایک دوسرے پر زیادتی، ظلم اور ناروا سلوک۔ چوری، ڈاکہ، قتل، بدکاری، جھوٹ، دھوکہ بازی، ملاوٹ، چور بازاری، ذخیرہ اندوزی، گراں فروشی، خدا سے غفلت، دین سے غفلت و استہزاء۔ یہ تمام وہ کام ہیں جن میں ہماری قوم جو امن و امان کی حامل، صدقِ مقال کی عامل، عدل و سلامتی کی داعی تھی، مبتلاء ہے، اور آج مجسم برائیوں کا نمونہ بنی ہوئی ہے۔ ہم مادیت کی دوڑ میں ایسے لگے کہ خدا سے بالکل غافل ہو گئے۔ اب خدا کا معاملہ بھی جواباً ہمارے ساتھ ویسا ہی ہونے لگا۔

مَا اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ، (پ۲۵)

تمہیں جو مصیبت آتی ہے وہ تمہارے کئے ہوئے کی وجہ سے ہوتی ہے (اور اللہ پھر بھی) بہت سی چیزوں سے درگزر فرمادیتا ہے۔

اگر ہم نے اپنے آپ کو درست نہ کیا تو خدا جانے ہمارا کیا انجام ہو۔ ہماری دُعا رہے کہ اللہ تعالیٰ ہم پر رحم فرمائے اور ہماری حالت درست فرما کر اپنی مرضیات پر چلائے۔ (آمین)

نعت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

ہو بیاں کچھ شانِ عالی احمدِ مختار کا
ہے یہی اہلِ محبت کے لیے خمرِ کہن

انبیاء سب مقتدی ہیں لیلۃ المعراج میں
اور امام الانبیاء مہمان ربِّ ذوالمنن

پہنچے جب سدرہ پہ تو جبریلؑ یہ کہہ کر رُکے
ہست سوزاں ایں تجلّی من نتانم پر زدن

عرش و کرسی، حوض و جنّت سب کا نظارہ کیا
کیا مُبارک ہے سفر، ہیں بے تکاں روح و بدن

ہے لقب "اُمّی" و لیکن جس طرف بھی دیکھئے
ان سے روشن عقل و دل، دین و فراست علم و فن

رحمۃٌ للعالمیں، محبوبِ ربِّ صادق امیں
منبعِ ایثار و شفقت، مظہرِ خلقِ حسن

ذاتِ عالی پر جہاں بھی جو بھی پڑھتا ہے سلام
لا کے پہنچاتے ہیں خدمت میں ملائک من و عن

پاس روضہ کے پڑھے جو اس کو سُنتے ہیں وہ خود
ہے یہ ثابت، اِس پہ شاہد ہیں روایاتِ سُنن

خاکِ پاکِ قبرِ اطہر عرشِ اعظم سے عزیز
متصل رہتا ہے جس سے شاہِ والا کا بدن

جسمِ اعطر کے پسینے کی مہک اللہ رے
رشکِ خوشبو، زینِ غنچہ، زیبِ گُل، جانِ چمن

زُلفِ شبگوں فیض بخشِ مشکِ عنبر آبنوس
آبِ دندانِ مجلّٰی سے خجل دُرِّ عدن

تاب کس کو ہے کہ دیکھے قدِ رعنا اِک نظر
ان کے آگے سرنگوں جنّت کے سب سرو سمن

پُر حیا و سُرمگیں آنکھوں میں ڈورے سُرخ ہیں
نرم ریشم سے ہتھیلی، لے نمونہ تن بدن

دو جہاں کی بادشاہی ان کے قدموں پر نثار
ان پہ قُربان مال و جاں، مادر، پدر، فرزند و زن!

مولانا محمود حسن گنگوہی

اسلام میں تصورِ عبادت

ڈاکٹر محمد آصف قدوائی

تمام مذاہب میں عقائد کے بعد سب سے زیادہ اہمیت عبادات کو دی گئی ہے۔ درحقیقت یہ دونوں ایک دوسرے کے ایسے لازم وملزوم ہیں کہ پہلے کو دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ رُتبے کے اعتبار سے ایک کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ عقیدہ عبادت کا محرّک، اس کا سبب اور اس کی عِلّت ہے اور عبادت اس کی غذا، اس کا ثبوت اور اس کا جسد ہے۔

اسی لیے یہ برابر دیکھنے میں آتا رہتا ہے کہ جتنی کمی یا کمزوری کسی شخص کی عبادت میں ہوتی ہے دلیل ہوتی ہے اسکے عقیدہ میں اسی قدر کمی یا کمزوری کی خواہ اس کی فطرت کی خود فریبی اسے تسلیم کرنے سے کتنا ہی گریز کیوں نہ کرے، عقیدہ درخت ہے اور عبادت اس کا پھل ـــــ اور درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔

اسلام کی خصوصیت اس بارے میں یہ ہے کہ دین کے مختلف شعبوں کی طرح اس نے عبادت کے مفہوم اور اس کے طریقوں کے متعلق بھی ایک ایسا جامع، واضح اور منضبط ہدایت نامہ پیش کیا جو ہر اعتبار سے بے نظیر ہے، چنانچہ اگر دُنیا کے کل مذہبوں کے بانیوں اور داعیوں کے تعلیم و عمل کا مطالعہ اس پہلو سے کیا جائے کہ عبادت کے معنیٰ پر کوئی تشفی بخش روشنی پڑ سکے اور اس کے بہترین طریقوں کا علم حاصل ہو سکے تو حضور سرورِ کائناتؐ کی ذات ہی ایک ایسی نظر آئے گی جو واضح حقیقت کی طرف رہنمائی کر سکے۔

اسلامی عبادات کا اوّلین طرّۂ امتیاز یہ ہے کہ وہ تنہا خدا کے لیے ہوتی ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو کسی بھی نوعیت سے شریک نہیں کیا جا سکتا۔ اس میں نہ تو پیغمبروں کا کوئی حصّہ

ہے، نہ ان کے گھر والوں کا اور نہ فرشتوں کا اور نہ ولیوں اور شہیدوں کا، اسلام کا یہ اٹل فیصلہ ہے کہ خدا کے علاوہ نہ تو زمین پر اور نہ آسمانوں میں کوئی شے یا ہستی ایسی ہے جو پرستش کے لائق ہو، جس کے سامنے انسان اپنی گردن جھکائے اور جس کی بارگاہ میں اپنی رُوح اور اپنے ضمیر کی انتہائی گہرائیوں سے نکال کر بندگی اور عبودیت کا نذرانہ پیش کرے۔

اِنَّ صَلَاتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (القرآن: انعام)

بلاشُبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک اللہ کے لیے ہے جو کُل جہانوں کا پروردگار ہے۔

اِنْ کُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا (القرآن: مریم)

زمین و آسمان میں جو کوئی بھی ہے وہ ضرور ایک دن اسی مہربان خدا کے سامنے غلام بن کر آنے والا ہے۔

عبادت کی اصل غایت بندہ کا خالق کے سامنے بندگی و بے چارگی کا اظہار، اس رحمٰن و رحیم کی یاد، اس کے بے نہایت احسانوں کا شکریہ، اس کی حمد و ثنا اور اس کی بڑائی اور یکتائی کا اقرار ہے ـــــ اور یہ اس وجہ سے نہیں کہ اس میں خالقِ مطلق کا کوئی فائدہ ہو، یا اس سے اس کی عظمت و کبریائی میں اضافہ ہوتا ہے (ایک حدیث شریف میں ہے کہ "اگر کل جہان کے لوگ اعلیٰ درجہ کے پرہیزگار اور عبادت گزار ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ کی شان اور اس کی بڑائی میں ذرّہ برابر زیادتی نہ ہوگی، اور اگر سب کے سب بدترین درجہ کے نافرمان اور فاسق و فاجر ہو جائیں تو اس کی عظمت اور بزرگی میں ذرّہ برابر کمی نہ ہوگی) بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں بندہ ہی کا خاص الخاص فائدہ اور اس کی تخلیق کی تکمیل ہے، کیونکہ دِل و دماغ اور نفس و رُوح میں صفائی و پاکیزگی پیدا کرنے اور بندہ کو خدا سے قریب کرنے اور اس کی خاص رضا و رحمت کا مستحق بنانے کا عبادت کے سوا کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

چنانچہ عبادت کی حیثیت اصلاً اور اوّلاً روحانی اور ملکوتی ہے، لیکن آج کل چونکہ مزاجوں پر مادیت کا غلبہ ہے اور ظاہر و محسوس نفع کے علاوہ ہر چیز کا انکار فہم و دانش کی بلوغت کی پہچان سمجھا جانے لگا ہے، اس لیے بعض حضرات اس سلسلہ کے فرائض و رسوم کی بھی

تشریح دُنیاوی فوائد کے زاویہ سے کرنے لگے۔ گویا کہ یہ چیزیں قدر کرنے اور اپنانے کے لائق دراصل اس وجہ سے ہیں کہ ان میں دُنیوی ترقی کے کیسے کیسے راز پنہاں ہیں، مثلاً یہ کہ نماز کی اصل حکمت یہ ہے کہ اس سے ملّت کو وقت کی پابندی اور امام کی اطاعت کی تعلیم ملتی ہے یا روزہ قوتِ ارادی کو بڑھانے اور نظم وضبط پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، یا حج فرض اس مصلحت سے کیا گیا ہے کہ کل دُنیا کے مُسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہو کر وقت کے مسائل پر غور کرنے کا موقع مِل جایا کرے۔

جیسا کہ اُوپر لکھا جا چکا ہے یہ اور اس قبیل کی تمام دوسری باتیں نتیجہ ہیں مادّی نقطۂ نظر سے مرعوبیت اور مادّی ترقی کی پرستش کا۔ جو لوگ اس طرز سے سوچتے ہیں انہوں نے مغرب کی تقلید میں مادیت کو اپنے دِل و دماغ پر اس درجہ حاوی کر لیا ہے کہ اس کی حیثیت بس ایک رسمی عقیدہ کی ہو گئی ہے۔ وہ خود اپنے ہی طلسم کے اسیر، اپنے ہی فریبِ نظر کے مارے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مذہب و اخلاق کو بھی فلسفۂ افادیت کے ہاتھوں رہن کر دیا ہے۔

یہاں ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ عبادت سے کوئی فائدہ ایسا نہیں حاصل ہوتا جس کا تعلق اس دُنیا سے ہو، لیکن ان فائدوں ہی کو عبادت کا اصل مقصد قرار دے لینا ایسا ہی ہے جیسے کہ کوئی شخص آم کا درخت لگائے اور نظر اس کے پھلوں پر رکھنے کے بجائے یہ کہے کہ جب یہ درخت بڑا ہو گا تو اس کا سایہ کتنا گھنا ہو گا، اس کے پتّوں سے کیسی اچھّی کھاد تیار ہو گی اور اس کی لکڑی کِن کِن مفید کاموں میں آئے گی۔

عبادت کے صحیح طریقوں کے متعلق انسان وحیٔ الٰہی کا محتاج ہے۔ وہ اپنے عقل و حواس سے بطور خود اس کا تعین نہیں کر سکتا کہ وہ کون سے افعال و اعمال ہیں جو تقرب الی اللہ اور تزکیۂ رُوح کا ذریعہ بن سکتے ہیں، کیونکہ اس کی قوتِ فکر بس ایک حد تک ساتھ دے سکتی ہے۔ اور تزکیۂ روح و قربِ خداوندی کے معاملات اس حد سے آگے کی چیز ہیں۔ ان معاملات میں تو صحیح رہنمائی بس وہی کر سکتا ہے جو اوّل و آخر بھی ہے اور ظاہر و باطن بھی۔

اسلام سے پہلے یہ خیال عام تھا کہ خدا کو خوش کرنے کے لیے بندہ کو چاہیئے کہ وہ دُنیا سے رُوٹھ جائے، علائق ترک کر دے، اور کسی غار یا جنگل میں جا کے بیٹھ جائے، دینداری کا کمال اس میں

سمجھا جاتا تھا کہ انسان اپنے اُوپر زیادہ سے زیادہ تکلیف ڈالے، رُوح کی نشوونما کا بس یہی ایک مجرّب نسخہ تھا، یعنی جسم کو آزار دینا، اسی لیے لوگ اپنے جسم کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے تھے، کوئی کھانے پینے کی مرغوب چیزیں اپنے اُوپر حرام کرلیتا تھا، کوئی اپنا ہاتھ خشک کرلیتا تھا کوئی منوں لوہا اپنے اُوپر لاد لیتا تھا، کوئی لیٹنے سونے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا، کوئی ننگے بدن صحراؤں میں مارا مارا پھرتا تھا، کوئی وحشی درندوں کے غار، خشک کنوئیں یا قبرستان کو اپنا مسکن بنالیتا تھا، کسی نے مجرّد رہنے کی قسم کھا رکھی تھی، زاہدان مرتاض اپنے بیوی بچوں سے دغا کرکے اور اُن کو دوسروں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر ویرانوں میں حق کی روشنی تلاش کیا کرتے تھے۔ اسلام نے ان غلو آمیز تصوّرات کی اصلاح کی۔ اس نے بتایا کہ جسم رُوح کا دُشمن نہیں ہے۔ اور یہی نہیں ہے بلکہ ان دونوں کا وجودِ باہم ہی زندگی کی قدرتی اساس ہے، دین کا کام سختی نہیں، آسانی پیدا کرنا ہے، وہ بندہ کے لیے اسی حد تک ہے جو اس کی استطاعت کے اندر ہے۔

لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا (القرآن، بقرہ)

خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کا مکلّف نہیں کرتا۔

یُرِیْدُ اللّٰہُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (القرآن۔ بقرہ)

خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔

وَمَا جَعَلَ عَلَیْکُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ (القرآن، حج)

اور تمہارے لیے دین میں خدا نے تنگی نہیں کی۔

انسان پر اگر اس کی رُوح کے حقوق ہیں تو اس کے جسم کے بھی حقوق ہیں۔

اسلام اس سے انکار نہیں کرتا ہے کہ مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے اور رُوح کو ملاءِ اعلیٰ کے فیضان کے قابل بنانے کے لیے کچھ ترکِ لذّات اور مشقّتِ نفس ضروری ہے، اسلامی عبادات میں سے روزے کی فرضیت اسی اصول پر مبنی ہے، لیکن جیسا کہ ان جملوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ روزہ مرغوباتِ شہوانیہ سے تعلق کم کرنے کی ایک دوا ہے، اور دوا کو ظاہر ہے کہ دوا ہی

کی مقدار میں ہونا چاہیئے۔ نہ اتنی کم کہ اس کا اثر ہی ظاہر نہ ہو سکے، اور نہ اتنی زیادہ کہ زندگی بھر دوا پینے کے سوا کوئی اور کام ہی نہ رہے، چنانچہ اسلام نے سال کے بارہ مہینوں میں ایک مہینہ روزے کے لیے مقرر کیا اور اس مہینہ کے بھی دن رات کے چوبیس گھنٹوں میں سے صرف چودہ یا پندرہ گھنٹے مسلمانوں سے کہا گیا کہ جس طرح تم سے پہلی والی اُمتوں کے لیے روزہ فرض کیا گیا تھا اسی طرح تمہارے لیے بھی فرض کیا گیا ہمیشہ کے لیے یا کسی بڑی لمبی یا غیر معینہ مدّت کے لیے نہیں بلکہ چند مقررہ دنوں کے لیے۔

یَا اَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَتَّقُوْنَ اَیَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ۔ (القرآن: بقرہ)

اے ایمان والو تم پر روزہ فرض کیا گیا جیسا کہ تم سے پہلی اُمتوں پر بھی فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ۔ چند گنے ہوئے دن۔

اور اسی کے فوراً بعد اُن رُخصتوں اور آسانیوں کا بھی اعلان کیا گیا جو بعض معذوری کی حالتوں میں انسان کے لیے ضروری ہیں، مثلاً یہ اگر سفر یا بیماری کی مجبوری ہو تو ان دنوں کے بجائے دوسرے دنوں میں روزہ رکھ کر گنتی پوری کر لو۔

فَمَنْ کَانَ مِنْکُمْ مَّرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ (بقرہ)

لیکن جو تم میں بیمار ہو یا سفر پر ہو، تو (اس کیلئے) دوسرے چند دنوں کی گنتی۔

اور جن کو کسی سچّی مجبوری کے باعث روزہ رکھنا قطعاً دُشوار ہو اُن کو کفّارہ کی اجازت ہے۔

وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ فِدْیَۃٌ طَعَامُ مِسْکِیْنٍ (بقرہ)

لیکن ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا گیا کہ قضا اور کفّارہ کی اجازت کے باوجود اگر کوئی دینی ذوق و شوق کے ماتحت روزے رکھے تو یہ نہ رکھنے اور شرعی رخصت سے فائدہ اُٹھانے سے بہتر ہے۔

فَمَنْ تَطَوَّعَ خَیْرًا فَھُوَ خَیْرٌ لَّہٗ ط وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (بقرہ)

تو جو کوئی شوق سے کوئی مزید نیکی کرے تو یہ بہتر ہے اس کیلئے اور رخصت و اجازت کی صورتوں میں بھی ہمت کر کے روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔

یہی حیثیت اعتکاف کی ہے جو روزوں کے زمانے کی ایک مزید عبادت ہے، یہ ایک امر مسلّمہ ہے کہ ذوقِ خدا طلبی کو اُبھارنے اور حاسۂ دینی کو ترقی دینے کے لیے یہ بہت مفید ہے کہ انسان وقتاً فوقتاً دُنیوی تعلقات سے ایک حد تک اجتناب و بے نیازی اختیار کرے، اور اپنی توجہ عالمِ ناسوت کے بجائے عالمِ ملکوت پر رکھے تاکہ دُنیا کے جھمیلوں سے یکسو ہو کر وہ تھوڑی دیر کیلئے ملاءِ اعلیٰ کی پاک مخلوقات میں داخل ہو جائے، اور جس طرح ان کی زندگی کا مشغلہ محض طاعت و عبادتِ الٰہی ہے، اسی طرح وہ بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا شغل حتی الامکان یہی بنالے، اس کے لیے اسلام نے رمضان کے آخری دس دنوں میں معتکف ہو جانے کا طریقہ مسلمانوں کو بتایا، مگر چونکہ کل مُسلمانوں کے اس پر پابند ہو جانے پر بہت دُشواریاں تھیں اور یہ قرینِ مصلحت بھی نہ تھا اس لیے اسے فرض نہیں کیا گیا بلکہ مستحسن قرار دیا گیا، وغیرہ وغیرہ۔

عبادات میں اسلام نے جو اعتدال کی تعلیم دی ہے اس کو اس واقعہ سے بخوبی سمجھا جا سکتا ہے۔

"آنحضرتؐ کے ایک صحابی تھے جن کا نام عثمان بن مظعون تھا۔ ان کی نسبت آپ کو معلوم ہُوا کہ وہ دن رات عبادت میں مشغول رہتے ہیں، دن کو روزہ رکھتے ہیں اور رات کو سوتے نہیں ہیں، بیوی سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں، آپ نے ان کو بلوا کر دریافت کیا کہ "کیوں عثمان! تم ہمارے طریقہ سے ہٹ گئے؟" انہوں نے جواب دیا "خدا کی قسم ہٹا نہیں ہوں، مَیں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہُوں۔" ارشاد ہُوا۔ "مَیں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں، اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں۔ عثمان! خدا سے ڈرو کہ تم پر تمہارے اہل و عیال کا بھی حق ہے، تمہارے مہمانوں کا بھی حق ہے اور تمہاری جان کا بھی حق ہے، تو روزہ بھی رکھو اور افطار بھی کرو، اور نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔"

اسی طرح اسلام نے یہ حقیقت بھی آشکار کی ہے کہ بندہ کے خالق سے تعلق کے دو رُخ ہیں ایک براہ راست خالق کی طرف ہے اور دوسرا اس کی مخلوقات کی طرف، گویا ایک کی نوعیت رُوحانی ہے اور دوسرے کی معاشرتی، چنانچہ قرآن نے عبادت کا لفظ بھی دو علیحدہ علیحدہ معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ایک معنی اصطلاحی ہیں جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں، یعنی وہ مخصوص

اعمال جن کا تعلق عبد و معبود کے سوا کسی تیسرے سے نہیں ہوتا اور جو محض اپنی عاجزی و درماندگی کے اقرار و اظہار اور خدا کی قدرت و عظمت کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت خم کرنے کی خاطر بندہ بجا لاتا ہے، دوسرے معنی اس سے بہت زیادہ وسیع ہیں اور ان میں دُنیا کا ہر نیک اور اچھا کام شامل ہے۔ دوسرے الفاظ میں اسی مادّی دُنیا میں رہتے ہوئے ہمارا ہر فعل ایک عبادت بنایا جاسکتا ہے، بشرطیکہ ہم اپنے زاویۂ نظر کی تصحیح کرلیں اور اپنے تمام کاموں کا مقصد خدا کی رضا جوئی اور اس کے احکام کی بجا آوری بنالیں، جو شخص تمام مخلوق سے کنارہ کش ہوکر ہمیشہ کے لیے کسی غار یا جنگل میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے، جو اسلام کی نظر میں خدا ہی کے حقوق ہیں، قاصر رہتا ہے اور اس طرح اس کی عبادت ناقص اور نامکمل رہتی ہے۔ اسلام کا تصوّرِ عبدیت یہ ہے کہ انسان زندگی کی ساری ذمّہ داریوں اور دُنیا کے علائق میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اسے بخوبی ادا کرتے ہُوئے خدا کی بندگی کا حق پُورا کرے۔

ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گزر ایسے مقام سے ہُوا جہاں ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا اور آس پاس کچھ جنگلی بوٹیاں لگی ہُوئی تھیں، ان کو اپنی عزلت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمتِ نبویؐ میں آکر عرض کیا کہ "مجھے گوشہ گیری کے لیے ایک بہت عمدہ جگہ ہاتھ آگئی ہے۔ سوچتا ہوں کہ وہیں جاکر ترکِ دُنیا کرلوں"۔ رسول اللہؐ نے جواب دیا کہ "مَیں یہودیت یا عیسائیت لے کر دُنیا میں نہیں آیا ہوں، مَیں آسان اور سہل اور روشن "حقیقت" (طرزِ ابراہیمی) لے کر آیا ہوں"۔ (مسند امام احمدؒ، جلد ۵، ص ۲۶۶)

ایک صحابی حضرت سعدؓ نے ایک بار دربارِ نبویؐ میں یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی ساری دولت راہِ خدا میں صَرف کردیں۔ آپ نے ان کو سمجھایا کہ "اے سعد! تم جو کچھ بھی اس نیت سے خرچ کرو کہ اس کی غایت خدا کی رضا جوئی ہے۔ اس کا ثواب ملے گا، حتیٰ کہ تم اس نیت سے جو لقمہ بھی اپنی بیوی کے مُنہ میں دو اس کا بھی ثواب ہے"۔ اسی طرح ایک دفعہ آپؐ نے حضرت ابنِ مسعودؓ کو نصیحت فرمائی کہ "مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پُورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے"۔ ایک اور موقع پر آپ نے یہاں تک فرمایا کہ "جو شخص

اپنی نفسانی خواہش جائز طور پر پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے"۔ اس پر بعض صحابہؓ نے عرض کیا کہ "یارسول اللہؐ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے"۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: "اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا گناہ نہ ہوتا؟ پھر جائز طور پر پوری کرنے میں ثواب کیوں نہ ہو"؟[1] (بخاری، باب کل معروف صدقۃ)

ان واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرت کے وہ کام بھی جو عموماً دُنیا کے کام سمجھے جاتے ہیں، اگر ان کو اس طرح کیا جائے کہ ان کا محرک خدا کی اطاعت شعاری ہو تو وہ دُنیا کے کام نہیں دین کے کام یعنی عبادات ہیں، کیونکہ عبادات اور غیر عبادات میں اصل فرق کاموں کا نہیں، نیت اور ارادہ کا ہے، اس کے برخلاف اگر اچھے سے اچھے کام نام و نمود یا کسی اور مادّی غرض کے ماتحت کیے جائیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں رہتی، اور اللہ کے یہاں ان کا کوئی اجر نہیں ہے۔

اسلامی عبادات کی چند دوسری خصوصیات یہ ہیں کہ مسلمانوں کو عبادت کے وقت کسی باہر کی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ نہ مورتوں اور مجسّموں کی، نہ چاند اور سُورج کی، نہ ناقوس اور گجر کی، نہ شمع اور فانوس کی، اور نہ آگ اور پانی کی۔

اسلام میں عبادت کے لیے کسی درمیانی وساطت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ خدا اور بندہ کے درمیان تعلق ایسا ہے کہ بندہ کو اس بارہ میں کسی مذہبی عہدہ دار کا رہینِ منت ہونے کی قطعی حاجت نہیں ہے۔ ہر مُسلمان آپ اپنا "مذہبی عہدہ دار" ہے۔ وساطت کا عقیدہ درحقیقت عہدِ جاہلیت کی ایک یادگار ہے۔ جب خدا کی صفات کا صحیح علم نہ ہونے کے سبب سے لوگوں نے اپنے بادشاہوں کے عادات و اطوار پر قیاس کر لیا تھا کہ کسی مقرّب خاص کا وسیلہ اختیار کیے بغیر اس تک رسائی مشکل ہے۔ اسلام نے آکر اس تخیل پر ضرب لگائی اور بتایا کہ یہ سب بے بنیاد تصوّرات ہیں۔ اس "وساطت" کے لیے کسی کے پاس کوئی دلیل و برہان اور کوئی

(باقی صفحہ ۳۲ پر)

[1] اس حدیث سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اس معاملہ میں حُسنِ نیت کے بغیر بھی ثواب ہے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اس معاملہ میں جائز و ناجائز کی تمیز کرتا ہے اور جائز راستہ اختیار کر کے ناجائز سے بچنے کا قصد کرتا ہے۔ درحقیقت اس طور سے رضائے الٰہی کا طلب گار ہوتا ہے۔ اور یہی بنیاد ہے جس پر اس کو ثواب ملتا ہے۔

اسوۂ حسنہ اور رفاہِ عامہ

حضرۃ مولانا
محمد متین ہاشمی

حقیقت یہ ہے کہ سیرت پاک نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کے کسی بھی گوشے پر کلام کرنا اور اس کا حق ادا کرنا کسی انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔

سیّد الکونین محبوب رب العالمین صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی حیاتِ طیبہ کا تو یہ عالم ہے کہ

ز فرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم
نظارہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اس مقام پر آکر سیرت پاک پر غور و فکر کرنے والا ہر انسان تھک جاتا ہے اور اس کی رنگا رنگی و بو قلمونی میں گُم ہو جاتا ہے۔ پھر عجیب بات یہ ہے کہ دُنیا کے کسی ریفارمر، نبی، رسول اور صاحبِ فکر کی سیرت اتنی تفصیلات کے ساتھ موجود نہیں ہے جتنی تفصیلات کے ساتھ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرتِ مُبارکہ۔

اس جامع شخصیت کی سیرت پاک کا جو گوشہ آج زیرِ بحث ہے وہ ہے "اسوۂ حسنہ اور رفاہِ عامہ" رفاہِ عامہ کے سلسلے میں اللہ تبارک تعالےٰ نے بارش میں نازل ہونے والے پانی کی مثال دیتے ہُوئے ایک عظیم ترین اصول بیان فرمایا ہے جس کی بنیاد پر رفاہِ عامہ کے سارے کاموں کو قیاس کیا جا سکتا ہے، چنانچہ سورۃ الرعد کی سترہویں آیت میں ارشاد ہے: وَ اَمَّا مَا یَنفَعُ النَّاسَ فَیَمکُثُ فِی الاَرضِ

اور جو چیز لوگوں کے لیے کار آمد ہے وہ دُنیا میں رہ جاتی ہے یعنی تمہارے سارے اعمال جو تم دُنیوی زندگی میں انجام دیتے ہو اپنے ذاتی مفاد کے لیے سب کے سب فانی ہیں تمہارے بعد انہیں کوئی یاد رکھنے والا نہ ہوگا۔ تمہارے وجود کی طرح تمہارے اعمال

بھی اس دُنیا میں داستان پارینہ بن کر رہ جائیں گے۔ بڑے بڑے بادشاہ، فاتح اور صاحبِ جاہ و جلال حکمران اس دُنیا میں آئے اور چند دنوں تک اپنی عظمت و برتری کا سکّہ بٹھا کر دُنیا سے چلے گئے لیکن آج ان کا حال یہ ہے کہ :

غرور تھا نمود تھا ہٹو بچو کی تھی صدا
آج تم سے کیا کہوں لحد کا بھی پتہ نہیں

البتہ جن لوگوں نے انسانیت کی خدمت میں اپنی زندگیاں کھپائیں یا اپنا مال خرچ کیا انہیں آج بھی بقائے دوام حاصل ہے اور دُنیا انہیں یاد کرنے پر مجبور ہے۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

قرآنِ کریم کی جس آیت کریمہ کا تذکرہ کیا گیا ہے جناب نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلّم کی حیاتِ طیبّہ اس کا مکمل اور جامع ترین نمونہ تھی۔ آپؐ نے ساری زندگی دوسروں کیلئے بسر کی جب تک دوسروں کو کھلا نہ لیا خود نہ کھایا۔ جب تک اصحاب صفہ کو سیراب نہ کرلیا دودھ یا پانی کا پیالہ اپنے لب ہائے مبارک سے نہ لگایا۔ عید کے دن جب ایک یتیم بچے کو اس لیے روتے دیکھا کہ اس کے بدن پر نئے کپڑے نہیں تھے تو اپنے نواسوں کا جوڑا اسے پہنا دیا چاہتے تو ساری دُنیا کا عیش و آرام اپنے گرد جمع کرلیتے چاہتے تو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے اپنے لیے محل تعمیر فرما لیتے لیکن ساری زندگی ایک ایسے حجرے میں بسر کردی کہ بارش ہوتی تو پورے حجرے میں ایک آدمی کے لیٹنے کی گنجائش نہ ہوتی راتیں کونوں میں کھڑے ہوکر بسر کرنا پڑتیں۔ بحرین سے دو لاکھ درہم آئے۔ صبح سے شام تک مسجدِ نبویؐ میں تقسیم فرماتے رہے اور رات کو دامن جھاڑ کر اُٹھ کھڑے ہُوئے۔ گھر میں آئے تو سیّد الانبیاء صلّی اللہ علیہ وسلّم کے گھر میں فاقہ تھا۔ صحابہؓ اصرار کرتے رہے بلکہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تو پشتِ مُبارک پر چٹائی کے داغ دیکھ کر زار و قطار رونے لگے اور عرض کیا سرکار! قیصر و کسریٰ پُرشکوہ محلات میں مخملی بستروں پر عیش و آرام کریں اور آپؐ کھُردری چٹائی پر رات بسر کریں۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے جواب دیا کہ انہوں نے دُنیا ہی کو اپنا مقصود بنالیا اور میرے

پیش نظر آخرت ہے یقیناً آپؐ کا یہ ارشاد بجا تھا اس لیے کہ دُنیا آخرت کی کھیتی ہے۔

الدنیا مزرعۃ الآخرۃ

خلقِ خدا کی خدمت انسانیت کو دُکھوں سے نجات دلانا نیکی کا یہی وہ بیج ہے جو آخرت میں برگ و بار لائے گا اور انسان کی اندھیری قبر میں روشنی کا چراغ بنے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے:

خصلتان لاشیئَ افضل منھما الایمان باللہ والنفع للمسلمین

وخصلتان لاشیئَ اخبث منھما الشرکُ باللہ والضرر بالمسلمین

ترجمہ: دو عادتیں ایسی ہیں جن سے کوئی شے افضل نہیں۔ ایک تو اللہ پر ایمان لانا اور دوسرے مسلمانوں کو نفع پہنچانا اور دو خصلتیں ایسی ہیں جن سے بڑھ کر کوئی شے خبیث اور بُری نہیں ایک تو اللہ کے ساتھ شرک کرنا اور دوسرے مُسلمانوں کو نقصان پہنچانا۔

بیہقی شریف کی ایک روایت میں ہے حضور صلّی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

الخلق عیال اللہ فاحب الخلق الی اللہ من احسن الی عیالہ

ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے اور مخلوقات میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ بندہ ہے جو اس کے کنبے کے ساتھ احسان کرے۔

اس حدیث کی جامعیت پر اگر غور کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ صرف مُسلمان ہی حُسنِ سلوک کے مستحق نہیں بلکہ سارے انسان مومن ہوں یا کافر کسی بھی مُلک کسی بھی رنگ، نسل اور خاندان سے تعلق رکھتے ہوں ہمدردی، دستگیری اور احسان کے حقدار ہیں۔ انسان تو انسان اس حدیث کی رُو سے تو حیوانوں کو بھی حُسنِ سلوک کا سزاوار قرار دیا گیا ہے اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جانوروں کے ساتھ بھی ظُلم اور زیادتی کرنے سے منع فرمایا ہے۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السماء (مشکوٰۃ)

تم زمین والوں پر رحم کرو، آسمان والا تم پر رحم کرے گا

یعنی اگر تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت تم پر نازل ہو اور تم دُنیا و آخرت کی مُشکلات سے محفوظ رہو تو انسانیت کی بھلائی کا کام کرو۔ دُکھی دِلوں کو سُکھ اور پریشان انسانوں کے لیے

سامانِ عافیت بہم پہنچاؤ۔ امام منذریؒ نے اپنی کتاب الترغیب والترہیب میں ایک حدیث نقل کی ہے۔ حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے:

سب سے زیادہ اللہ تبارک وتعالےٰ کو یہ عمل پسند ہے کہ تم کسی مسلمان کے دِل کو خوش کردو یا اس کی کسی تکلیف کو رفع کردو۔

مسلمان کے دِل کو خوش کرنا مختلف طریقوں سے ہوسکتا ہے کسی مالی امداد کے ذریعے یا مسلمانوں کے واسطے کوئی تعلیمی ادارہ قائم کرکے یا ان کے لیے پینے کے صاف پانی کا انتظام کرکے، پُل بنا کر، باغ بنا کر، پارک کے لیے زمین دے کر یا سرائے بنا کر یا ان کے کاروبار کا کوئی مرکز تیار کرکے اور مسلمانوں کی تکلیف دُور کرنے کا موجودہ دَور میں اس سے بڑھ کر کوئی ذریعہ نہیں ہے کہ ان کے لیے ہسپتال بنائے جائیں جن میں انہیں ہر قسم کی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں۔ بیوگان کے مراکز تیار کیے جائیں، لاوارث میّتوں کے دفن وکفن کا انتظام کیا جائے۔ یتیم خانے بنائے جائیں۔ یہ وہ اعمال ہیں جو ہزاروں نفل نمازوں اور روزوں سے زیادہ اللہ تبارک وتعالیٰ کو محبوب ہیں۔

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم، عامۃ النّاس کو مشکلات سے بچانے اور ان کی فلاح و بہبود میں اسقدر دِلچسپی لیتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالےٰ نے اپنے اسماءِ حسنیٰ میں سے دو نام آپ کو عطا فرمائے ارشادِ ربّانی ہے:

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمؤمنین رؤوف رحیم (سورۃ التوبہ: ۱۲۸)

ترجمہ: بیشک تمہارے پاس ایک برگزیدہ پیغمبر آئے ہیں تمہاری ہی جنس میں سے۔ جو چیز تمہیں مضرت پہنچاتی ہے انہیں بہت گراں گزرتی ہے۔ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں۔ ایمان والوں کے حق میں تو بڑے ہی شفیق ہیں، مہربان ہیں۔

ان آیتوں میں دو جملے خاص طور پر غور طلب ہیں ایک تو "عزیز علیہ ما عنتم" یعنی ہر وہ چیز جو تم کو تکلیف دینے والی ہو یا مشقت میں ڈالنے والی ہو ان کے اُوپر بہت گراں ہے۔ یہ انسانیت یا انسانی زندگی کا منفی پہلو ہے جسے فلسفے کی زبان میں دفعِ مضرات کا پہلو کہا جاتا

ہے اور دوسرا جملہ "حریص علیکم" یعنی تمہیں دُنیا و آخرت میں ہر قسم کی کامیابی فلاح سکون و طمانیت پہنچانے پر وہ حریص ہیں یہ مثبت پہلو ہے جسے فلسفے کی اصطلاح میں جلبِ منفعت کا پہلو کہا جاتا ہے۔ مخلوقات کیلئے نبیٔ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کی سیرت اور اسوہ کے یہ دونوں پہلو آپ کی طبیعت مُبارکہ میں اس طرح داخل تھے کہ آپ کی فطرتِ ثانیہ بن چکے تھے ان دونوں خصوصیات کی بنا پر اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنے اسماءِ حسنیٰ میں سے دو نام رؤف اور رحیم آپ کو عطا فرمائے۔ معنی کے اعتبار سے یہ دونوں الفاظ کافی مشابہ ہیں لیکن دونوں کے درمیان ایک نازک اور لطیف سا فرق ہے رؤوف کے معنی بھی رحم کرنے والا اور رحیم کے معنی بھی رحم کرنے والے کے ہیں، لیکن رؤف اس رحم کرنے والے کو کہتے ہیں جو اس وقت رحم کرے جب کہ رحم کی ضرورت ہو اور رحیم اس رحم کرنے والے کو کہتے ہیں جس کا رحم ہر وقت اور مسلسل ٹھاٹھیں مارتے ہُوئے سمندر کی طرح جاری ہو۔ سچ پوچھیے تو اللہ تعالیٰ کی صفاتِ کمالیہ میں سب سے اہم صفت رحمت ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ اس کی تمام صفاتِ کمالیہ کا منبع ہی رحمت ہے۔ اسی لیے قرآنِ کریم میں بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہتے وقت اللہ کے اسم ذات کے بعد سب سے پہلے جو اسماءِ صفاتی یعنی رحمٰن و رحیم استعمال کیے گئے ہیں دونوں رحمت سے ماخوذ ہیں اور اللہ تبارک و تعالیٰ نے ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلّم کو اپنی صفاتِ کمالیہ میں بہرہ وافر رحمت سے عنایت فرمایا ہے۔ قرآنِ کریم میں اسی لیے ارشاد فرمایا گیا: وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ

اور نہیں بھیجا ہم نے آپ کو مگر تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر، دراصل رفاہِ عامہ میں جو چیز انسان کو رفاہِ عامہ کے اعمال کی طرف متوجہ کرتی ہے وہ یہی جذبۂ رحمت ہے۔ لہٰذا ثابت ہُوا کہ جو شخص رفاہِ عامہ کے اعمال کی طرف متوجہ ہوتا ہے وہ صحیح معنوں میں نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرتا ہے اور اس طرح بقائے دوام کا مالک بنتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے۔

اذا مات الانسان انقطع عمله الا من ثلثة صدقة جارية او علم ينتفع به او ولد صالح يدعو له۔ رواه مسلم (مشکوٰۃ شریف)

جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے سارے اعمال اس سے منقطع ہوجاتے ہیں مگر تین اعمال ایسے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان کا ثواب اس کو ملتا رہتا ہے۔ ایک تو صدقہ جاریہ دوسرے ایسا علم جس سے اس کے مرنے کے بعد بھی لوگ فائدہ اٹھائیں یا اولادِ صالح جو مرنے کے بعد اپنے والدین کے لیے دُعائے مغفرت کرے۔

یہی صدقہ جاریہ مرنے کے بعد بھی انسان کو زندہ رکھتا ہے اور اس کا نام صفحۂ دہر پر نقش دوام بن کر مرتسم ہوجاتا ہے۔ حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم نے رفاہِ عامہ کو اتنی اہمیت دی ہے کہ اسے ایک روایت کے مطابق ایمان کا حصہ اور ایک روایت کے مطابق صدقہ قرار دیا ہے، چنانچہ آپؐ نے ارشاد فرمایا:

اما طتك الحجر والشوك والعظم عن الطريق لك صدقة (ترمذی)

راستے سے تیرا پتھر کانٹے ہڈی (اور ہر تکلیف دہ چیز) کو ہٹا دینا تیرے لیے صدقہ ہے۔

اس حدیث سے یہ ثابت ہوا کہ راستے کو ناجائز تجاوزات اور غلط پارکنگ کے ذریعے تنگ کرنا سخت گناہ ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ امام بخاریؒ نے شہر بخارا کے باہر ایک مہمان سرا بنوائی تھی اس کی تعمیر کے وقت جو مزدور معماروں کو اینٹیں پہنچاتے تھے ان میں خود امام بخاریؒ بھی شامل تھے۔ محدثین کے تاجدار یہ امام ربانیؒ اپنے سر پر اینٹیں رکھ کر لیجاتے اور معماروں کو پکڑاتے۔ ایک شاگرد سے دیکھا نہ گیا تو اس نے ازراہِ دِلسوزی عرض کیا:

"حضرت! آپ کو اس محنت کی کیا ضرورت؟ ہم لوگ اس خدمت کے لیے حاضر ہیں۔"

امام علیہ الرحمہ نے فرمایا: هذا الذی ینفعنی۔ ہم کیا جانو اصل میں یہی کام ہے جو مجھے نفع دے گا۔ یعنی رفاہِ عامہ کا کام۔

واضح رہے کہ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا دعویٰ دلیل چاہتا ہے جس طرح کسی عدالت میں کوئی دعویٰ بغیر ثبوت و دلیل کے قابلِ سماعت نہیں ہوتا اس طرح دربارِ نبوّتؐ میں بھی کوئی دعویٰ محبت بغیر دلیل کے قابلِ قبول نہیں اور از روئے قرآن اللہ و رسولؐ سے محبت کرنے کی صرف ایک دلیل ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

اے نبی! آپ کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میرا اتباع کرو اللہ تم سے خود محبت کرنے لگے گا۔

ایک عرب شاعر ورّاق نے اس آیت کے مفہوم کو یوں ادا کیا ہے:

تعصی الالٰہ وانت تظھر حبہ　　ھٰذا العمری فی القیاس بدیع

لوکان حبک صادقا لاطعتہ　　ان المحب لمن یحب مطیع

ترجمہ: تو اللہ کی نافرمانی کرتا ہے اور اس کے ساتھ دعوئ محبت بھی کرتا ہے یہ میری جان کی قسم بعید از قیاس بات ہے۔ اگر تو اپنی محبت میں سچا ہوتا تو ضرور اس کی اطاعت کیے ہوتا، کیونکہ عاشق تو بہر حال اپنے محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے۔

اکبر الہ آبادی مرحوم اسی کا رونا رو کر دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

جب سر میں ہوائے طاعت تھی سرسبز شجر امید کا تھا
جب صرصرِ عصیاں چلنے لگی اس پیڑ نے پھلنا چھوڑ دیا
اللہ کی راہ اب تک ہے کھُلی آثار و نشاں سب قائم ہیں
اللہ کے بندوں نے لیکن اِس راہ پہ چلنا چھوڑ دیا

بقیہ: اسلام میں تصورِ عبادت

فرمانِ الٰہی نہیں۔ یہ سب کم نظری کے گھڑے ہُوئے بُت ہیں، جن کے رشتے سے ذاتِ الٰہی پاک ہے اور جن کی ضرورت سے وہ بے نیاز ہے۔ وہ اپنی ذات و صفات اور اپنی مرضیات و منہیات کا علم تو براہِ راست بے شک مخصوص انسانوں ہی کو دیتا ہے جنہیں "نبی" اور "رسول" کہا جاتا ہے۔ اُمتیں ان ہی مقدس اور منتخب ہستیوں سے یا ان کے نائبین سے یہ سب کچھ معلوم کرتی ہیں۔ لیکن جہاں تک انسان کی پکار و فریاد سننے یا اس کی عبادت کے قبول کرنے کا تعلق ہے تو اس کے لیے اُس نے کوئی بھی درمیانی واسطہ نہیں رکھا ہے وہ خود انسان کی رگِ جان سے بھی قریب ہے اور اس قرب کے بعد ہر واسطہ بے معنی۔

دارالافتاء جامعہ مدنیہ لاہور

حضرۃ مولانا مفتی عبدالواحد
نائب مفتی جامعہ مدنیہ، لاہور

میں ایک آزاد گھرانے کی عورت تھی۔ میری شادی ایک ایسے گھرانے میں ہوئی جہاں پردے کی پابندی ہے۔ ٹی وی اور نیل پالش ممنوع ہیں۔ مَیں نے شوہر کی خاطر سب کچھ برداشت کیا۔ اس سال میرے شوہر حج کرنے گئے۔ روضۂ مُبارک پر بھی حاضری ہوئی۔ اس موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت ہُوئی۔ حضورؐ نے فرمایا "تم میری آل میں سے ہوکر کیسی صورت لے کر آئے ہو، داڑھی رکھو" تو میرے شوہر نے ڈاڑھی رکھ لی۔ مَیں چاہتی ہوں کہ وہ داڑھی نہ رکھیں۔ جب بھی ان کی صورت دیکھتی ہوں روتی ہوں اور میری دُنیا ویران سی لگتی ہے۔ آپ یہ بتائیے کہ اگر وہ ڈاڑھی منڈالیں تو کیا کفارہ ہوگا۔ اور کیا میں گناہ گار ہوں گی؟ میری اس بے چینی کا حل بتاکر ممنون فرمائیں۔

ایک پریشان بہن

الجواب باسم ملہم الصواب حامداو مصلیا

جہاں تک مسئلے کا تعلق ہے تو مَرد کے لیے داڑھی رکھنا واجب ہے اور اس کو مونڈنا ناجائز اور گناہ کی بات ہے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے لہٰذا اس میں کسی مخلوق کی دِلجوئی یا پسند و ناپسند کی خاطر نافرمانی نہیں کی جاسکتی لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (جس کام میں خالق کی نافرمانی ہوتی ہو اس میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں کی جائے گی) اور شریعت میں کوئی ایسی صورت بھی نہیں ہے کہ کوئی شخص

داڑھی نہ رکھے اور اس کے متبادل کوئی فدیہ یا کفارہ دیدے۔

آپ کے شوہر نے داڑھی رکھ کر اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کو پورا کیا ہے۔ اس کو ناپسند کرتے ہوئے شوہر سے مطالبہ کرنا کہ وہ داڑھی مونڈ دے یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور گناہ کی بات ہے، اور اگر آپ کے شوہر آپ کی بات پر عمل کریں تو یہ بھی بڑے گناہ کی بات ہے۔ خصوصاً جبکہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم بھی دیا ہے اور داڑھی نہ رکھنے پر ناپسندیدگی کا اظہار بھی کیا ہے۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کوئی مسلمان اتنا جری اور بے باک بھی ہو سکتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کسی بات کا حکم دیں اگرچہ خواب ہی میں ہو (کیونکہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھنا سچا ہی ہوتا ہے) اور وہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے سرتابی کرے۔

جہاں تک اس کی آپ کے بچپن سے نفسیاتی الجھن ہونے کا تعلق ہے تو اس کے دو حل ہیں۔ ایک تو وہ ہے جو ہم آگے ذکر کریں گے اور دوسرا وہ ہے جس کو آپ نے اختیار کیا ہے۔

آپ نے جس طریقے کو اختیار کیا ہے وہ الجھن کا حل نہیں ہے بلکہ درحقیقت الجھن کو ناقابلِ شکست سمجھ کر آپ نے یہ سوچا ہے کہ

اب آپ کے شوہر کسی طریقے سے داڑھی مونڈھ دیں۔ اگرچہ اس کا کچھ کفارہ ہی دینا پڑے، لیکن اس سے بہت سی پیچیدگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

۱: آپ کے شوہر جب آپ کی بات نہیں مانیں گے تو آپ کی الجھن بدستور باقی رہے گی۔

۲: اس میں یہ خطرہ بھی ہے کہ خود داڑھی کے بارے میں کراہت و ناپسندیدگی دل میں پیدا ہو، حالانکہ وہ تمام انبیاء علیہم السلام اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کا طریق رہی ہے۔

۳: داڑھی رکھنے سے روکنا یا رکھ کر مونڈھنے کا مطالبہ ہوگا جو بڑے گناہ کی بات ہے کیونکہ اس میں دین کے ایک واضح حکم سے روکنا ہے۔

اب ہم اس کا حل بتاتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ ہمت و سمجھ کے ساتھ اس کوفت و الجھن کا مقابلہ کریں۔ یہ کوئی ناممکن بات نہیں۔ حالات کے تحت آدمی کو بہت کچھ تغیرات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ بس ذرا ہمت کی ضرورت ہے۔ کچھ عرصے میں انشاء اللہ یہ الجھن ختم ہو جائیگی

اور ذہن بدل جائے گا۔اس کے لیے مندرجہ ذیل باتوں کو ذہن نشین کرلیں۔

۱: شریعت کے احکام کا جس طرح مَردوں کو حکم ہے اسی طرح عورتوں کو بھی حکم ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ دین وشریعت کے احکام میں عورتیں مَردوں کے تابع ہوں کہ اگر مَرد کہیں کہ دین کے مطابق کام کرو تو کرلیا اور اگر مَرد دین کے خلاف کام بتائیں مثلاً بے پردگی اختیار کرنے کو کہیں یا سر کے بال کٹوانے کو کہیں یا نماز ترک کرنے کو کہیں یا فلم و ٹی وی دیکھنے کو کہیں تو ان کی اطاعت کرلی۔شریعت نے مَردوں کو اس کا اختیار نہیں دیا کہ وہ عورتوں کو خلافِ شرع کاموں کو کرنے کا کہیں۔اگر وہ کہیں گے تو نافرمان اور گنہگار ہوں گے۔ اسی طرح عورت کو بھی یہ حکم نہیں ہے جو شوہر کو ہے اس پر عمل کرو بلکہ اگر وہ شریعت کا حکم بتائے تو اس پر عمل کرو اور اس کو شوہر کا احسان سمجھو اور اگر وہ خلافِ شریعت حکم کرنے کو کہے تو قطعاً اس کی بات نہ مانو لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔غرض شریعت کا جو بھی حکم ہو عورت کو چاہیئے کہ اس کو اپنی ذمہ داری سمجھے۔

۲: مرد کے لیے دَاڑھی اتنی ہی ضروری واہم ہے جتنے کہ عورت کے لیے سر کے بال۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دَاڑھی کے بڑھانے کو فطرت میں سے شمار کیا ہے۔اور جو لوگ دَاڑھی مونڈھتے ہیں وہ فطرت اللہ کو بگاڑتے ہیں۔قرآنِ پاک میں ہے کہ شیطان نے اللہ تعالیٰ سے کہا تھا کہ مَیں اولادِ آدم کو گمراہ کروں گا اور مَیں ان کو حکم دوں گا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق کو بگاڑا کریں گے۔اور دَاڑھی مونڈھنا بھی اس میں داخل ہے اور یہ تو کافروں، مُشرکوں اور مجوسیوں کا شیوہ تھا۔شاہِ ایران کے قاصد رسول اللہ صلّی علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو ان کی دَاڑھیاں مونڈھی ہُوئی اور مونچھیں بڑھی ہُوئی تھیں۔آپؐ نے ان کی طرف نظر کرنا بھی پسند نہ کیا اور فرمایا تمہاری ہلاکت ہو تمہیں یہ شکل بگاڑنے کا کس نے حکم دیا ہے۔وہ بولے کہ یہ ہمارے راجہ یعنی شاہِ ایران کا حکم ہے۔رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا لیکن میرے الو نے تو مجھے دَاڑھی بڑھانے اور مونچھیں کٹوانے کا حکم فرمایا ہے۔

اب اس دَور میں آکر مسلمانوں نے بھی کافروں کی دیکھا دیکھی دَاڑھیاں بھی مونڈھنی شروع کردیں۔جو چیز فطرت کے مطابق تھی اور چہرے کی زینت تھی اس کو ناپسند

کرنے لگے اور اس کو مولویوں کا کام سمجھ لیا۔ کیا اس سوچ کو بدلنا ضروری نہیں ہے؟ کیا جس چہرے کو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے دیکھنا پسند نہ کیا اور آپ نے اس کو شکل بگاڑنا کہا اور اس پر ہلاکت کی بد دعا دی۔ کیا کسی مسلمان کی غیرت گوارا کرتی ہے کہ اس کو اپنا جیون ساتھی بنائے اور اس کو خوبصورت کہے۔ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کے داڑھی کے متعلق ان فرامین کو جان کر بھی اگر کوئی ایسی بات کرے تو اس کو اپنے اسلام کی خیر منانی چاہیئے۔

۳ : پابندی سے کچھ وقت نکال کر اس بات کو سوچا کریں کہ دُنیا کی یہ سب چیزیں خواہ وہ صورتیں ہوں ختم ہو جانے والی ہیں۔ دُنیا میں کسی تکلیف یا بڑھاپے سے یہ سب رونق ختم ہو جائے گی اور مرنے پر قبر تو کچھ نہ چھوڑے گی اور وہ وقت بہر حال جلد آنے والا ہے۔ اس کے بعد پھر یہ خیال کریں کہ آخرت کے مراحل ہیں۔ اگر ہم نے دین کے حکم پر عمل کیا اور رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کی شکل پر اپنی شکل بنائی تو اس پر اجر ملے گا ورنہ نہ جانے کتنے سخت اور ناقابلِ برداشت حالات سے گزرنا پڑے۔ اللہ تعالیٰ سب کو صحیح سمجھ عطاء فرمائے۔ فقط واللہ تعالیٰ اعلم۔

بقیہ : معصیت اور اس کے اثرات

جس کو اللہ تعالیٰ اس کے جُرم کی پاداش میں ذلّت نصیب کرے کون ہے جو اسے عزّت کی زندگی عطا کر سکے؟ گناہ گار نے اپنے اخلاق و اعمال سے دُنیا کو متعفّن بنا ڈالا ہے، وہ جدھر جاتا ہے تعفّن پھوٹ پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے :

قد افلح من زکّٰھا و قد خاب من دسّٰھا (الشمس)

کامیاب ہو گیا جس نے اس (نفس) کو پاک کیا اور نامراد رہا جس نے اسکو گندہ کیا۔

اِنَّ الابرار لفی نعیم وان الفجار لفی جحیم (مطففین)

بلاشبہ نیک لوگ نعمتوں میں ہیں اور بدکار لوگ جہنّم میں

آخرت کا جہنّم تو مرنے کے بعد سامنے آئے گا مگر دُنیا میں تو اس کی جھلک نظر آنی چاہیئے تاکہ بندگانِ الٰہی عبرت و بصیرت حاصل کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ تمام لوگوں کو معصیت اور اس کے شر سے محفوظ رکھیں۔

حضرۃ مولانا قاری
عبدالرشید رحمہ اللہ

اپنے بانیٔ محترم کے سانحۂ ارتحال کے بعد جامعہ مدنیہ لاہور کو ایک بڑا حادثہ یہ پیش آیا کہ اس کے ہی ایک لائقِ رشک اور مایۂ ناز فرزند حضرۃ علامہ مولانا قاری عبدالرشید صاحبؒ ۱۷ شوال ۱۴۱۲ھ کو اسے داغِ جدائی دے گئے

حضرۃ قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا شمار ملک کے ممتاز اور جید علمار کرام میں ہوتا تھا۔ آپ عظیم محقق اور بلند پایہ مدرس و معلم تھے۔ آپ کی ذات ان گنت محاسن و کمالات کی جامع تھی۔

حضرۃ قاری صاحبؒ کے علمی کمالات اور عملی میدان میں آپ کے کارہائے نمایاں کے دیکھنے سے اکابر علمارِ سلف کی یاد تازہ ہوجاتی تھی۔

آپکی حذاقت، درّاکی اور ژرف نگاہی و باریک بینی پر آپکے رفقار ہی نہیں آپکے اساتذہ تک عش عش کر اٹھتے۔ مسلکِ حقہ کی تبلیغ و اشاعت کا جو ولولہ حضرۃ قاری صاحبؒ کو ودیعت کیا گیا تھا وہ کم بہت ہی کم لوگوں کو نصیب ہوتا ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ اپنی تھوڑی سی عمر میں حضرت قاری صاحبؒ دینِ حق کی فقید المثال اور تاریخی خدمات انجام دے گئے۔ فجزاھم اللہ احسن الجزاء۔

حق تعالیٰ دینِ متین کے لیے آپ کی مساعیٔ جلیلہ کو شرفِ قبول سے نوازے، انہیں بلند سے بلند تر درجات پر فائز فرمائے اور جامعہ مدنیہ اور صحیح العقیدہ مسلمانوں کو ان کا بدل عطا فرمائے۔

ذیل میں آپ کے ایک اُستاد حضرۃ علامہ مولانا محمد ظہور الحق دامانی مدظلہم کا آپکے متعلق مختصر وقت میں لکھا گیا مختصر مضمون پیش کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

پیکرِ اخلاص نمونۂ اسلاف حضرت قاری عبدالرشید صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق حیران ہوں کہ کیا لکھوں۔ غالباً ۱۹۶۴ء کی بات ہے جب جامعہ مدنیہ لاہور کی اپنی کوئی عمارت نہیں تھی اور وہ عارضی طور پر مکی مسجد انارکلی میں علمی خدمات انجام دے رہا تھا۔ بندہ کو انہی حالات میں خدمت کا موقع ملا۔ قاری صاحبؒ نے اُس وقت حفظِ قرآن سے فارغ ہوکر ابتدائی کُتب کی پڑھائی

شروع کی تھی۔ میرا بیٹا اظہار الحق آپ کا ہم سبق تھا۔ میری بدقسمتی سے اظہار یہ سفر جاری نہ رکھ سکا اور قاری صاحب ہمیشہ اس کی مفارقت پر افسوس کرتے رہے۔

اللہ تعالیٰ نے جو گوناگوں صلاحیتیں قاری صاحب میں ودیعت کر رکھی تھیں ان کا اندازہ ان کی ابتدائی طالب علمی کے دَور میں کماحقہٗ نہ ہو سکا، یعنی کم از کم مجھے اُس وقت یہ اندازہ نہ ہو سکا کہ یہ بھولا بھالا بچّہ فراغتِ علم کے بعد مسندِ تدریس پر بیٹھتے ہی ایک محقق، پختہ کار، ذہین و فطین اور عبقری انسان معلوم ہونے لگے گا۔

قاری صاحب زمانۂ طالب علمی میں اپنے تمام ساتھیوں سے ممتاز تھے۔ اپنے اساتذہ کا انتہائی احترام کرنے والے، کبھی کسی استاذ کو آپ سے شکایت کا موقع نہیں ملا۔ اور پھر جب وہ خود استاذ ہوئے تو اس وقت وہ دوسرے تمام اساتذہ سے ممتاز رہے۔ اپنے شاگردوں سے انتہائی شفقت اور محبت سے پیش آتے۔ نتیجۃً آپ کے تلامذہ آپ پر فدا و قربان ہونے کے لیے مستعد۔ غرض آپ کی زندگی کا ہر دَور نرالا اور قابلِ رشک تھا۔

قاری صاحبؒ کا لڑکپن اور جوانی سب بندہ کے سامنے ہیں۔ مَیں نے کبھی بھی لباس وغیرہ کے بارے میں ان کو تکلف کرتے نہیں دیکھا۔ حتیٰ کہ شادی کے وقت دولہا بن کر بھی آپ نے اپنی وضع کو نہیں بدلا۔ ایسے سادہ، منکسر المزاج شخصیات کا اس دَور میں ملنا بہت مشکل ہے۔

ہماری دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی خدمات دینیہ کو قبول فرمائے۔ انہیں کروٹ کروٹ جنّت نصیب فرمائے اور ہم سب پسماندگان کو صبر کی توفیق دے۔ (آمین)

ماہنامہ
انوارِ مدینہ
لاہور

اِس دینی رسالہ سے آپکا تعاون آپ کے اَجر اور اسکے اِستحکام، بقاء، اور ترقی کا باعث ہوگا۔

★ اِس کے خریدار بنیئے اور دوسروں کو خریدار بنائیے۔
★ اِس میں اشتہار دیجئے اور دوسروں سے دلوائیے
★ اِس کے لیے مضامین لکھیئے اور اپنے مضمون نگار دوستوں کو اس کیلئے مضمون لکھنے کی ترغیب دیجئے۔

عیدالاضحیٰ لیکن کس دن؟

حضرۃ مولانا خالد محمود
مدرس جامعہ مدنیہ، لاہور

۹ جون ۱۹۹۲ء کے روزنامہ جنگ لاہور میں ایک مضمون "عیدالاضحیٰ لیکن کس دن؟" نظر سے گزرا۔ مضمون نگار دوسرے ممالک میں عیدالاضحیٰ مکہ مکرمہ کے دس ذوالحجہ سے ایک دو دن مؤخر ہونے کو وحدتِ اُمت میں ایک بہت بڑا رخنہ تصوّر کرتے ہیں۔ یہ واقعی ایک نہایت ہی عجیب و غریب اور نادر فکر ہے۔

صاحبِ مضمون نے اپنے ان افکارِ غریبہ کی بنیاد چند مقدمات پر رکھی ہے:

۱: "یوم النحر یوم العرفہ کے فوراً بعد کا اگلا دن ہے" خواہ وہ کسی دُور کے مُلک میں ہی کیوں نہ ہو۔

۲: جب "ٹی وی" پر نو ذوالحجہ (یوم العرفہ) کا رُوح پرور اجتماع اپنی آنکھوں سے دیکھا جائے اور حج کا خطبہ اپنے کانوں سے سُنا جائے تو اس سمعی بصری شہادت کے بعد سب ممالک میں فوراً نو ذوالحجہ ہو جانی چاہیئے تاکہ اگلے دن کو دس ذوالحجہ قرار دیا جاسکے۔ اب عید کو اپنے ہاں مؤخر کرنا اور اسے مکہ مکرمہ سے ایک دو دن کے فاصلے پر لے جانا نہایت بوالعجبی اور اضحوکہ ہے۔

موصوف لکھتے ہیں:

"کیا یہ صورتحال مضحکہ خیز نہیں کہ دس تاریخ کو لوگ ٹی وی پر اپنے کانوں سے خطبۂ حج سُنیں،

اپنی آنکھوں سے عرفات کا رُوح پرور اجتماع دیکھیں .... اور پھر اس سمعی اور عینی شہادت کے بعد حکماً عید اگلے دِن منانے کی بجائے تیسرے دن منائیں ؟ کیا اس بوالعجبی سے ہم اپنے آپ کو اضحوکہ دہر نہیں بناتے ؟ برملا اپنی تفضیح و تضحیک کا سامان نہیں کرتے ؟

۳ : عید الفطر کے بارے میں اختلافِ مطالع کے جو عذر ہائے لنگ پیش کیے جاتے ہیں، عید الاضحیٰ میں ان کی گنجائش نہیں۔

موصوف لکھتے ہیں :

"ہم عید الفطر کو متفقہ طور پر ایک دن منانے کے لیے تیار نہیں اور اس کے لیے اختلاف مطالع کے عذر ہائے لنگ پیش کرتے رہتے ہیں۔ مگر عید قربان میں تو کسی ایسی بہانہ سازی کسی ایسی دراندازی کی گنجائش نہیں۔"

جہاں تک صاحبِ مضمون کے پہلے مقدمے کا تعلق ہے۔ "یوم النحر یوالعرفہ کے فوراً بعد کا اگلا دن ہے۔"

ہمیں ان کے اس دعوے پر ان کے پُورے مضمون میں بار بار تلاش کے باوجود کوئی دلیل نہیں ملی، لہٰذا جب تک اس دعوے پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جاتی اس وقت تک اس مفروضے کو پُورے مضمون کی جان بنانا وقت کا ضیاع ہوگا۔

اب جہاں تک دوسرے اور تیسرے مقدمے کا تعلق ہے تو اس میں جناب موصوف کا عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے درمیان فرق کرنا خود افکارِ غریبہ میں سے ہے، کیونکہ صاحبِ موصوف کی رائے کو بنیاد بنا کر کہا جا سکتا ہے کہ عید الفطر رمضان کے آخری روزے کا اگلا دن ہے، اب جب ہمیں ٹی وی پر سمعی و بصری شہادت کے ساتھ مکہ مکرمہ کا آخری روزہ معلوم ہونا ممکن ہے تو پھر عید الفطر کو تیسرے یا چوتھے دن تک لے جانا چہ معنی دارد ؟ یہ مشکل جب اسی وقت ٹی وی دیکھتے ہی حل ہو جاتی ہے تو اس کے لیے ایک دو دن تاخیر کی رعایت نکالنا اور اسے عید الاضحیٰ سے مختلف رکھنا واقعی افکارِ غریبہ میں سے ہے۔

نیز صاحبِ مضمون کے اشتیاقِ وحدت کو مدنظر رکھتے ہوئے دیگر عبادات میں بھی اس شوق وحدت کو اُبھارا جا سکتا ہے۔

مثلاً نمازوں کے اوقات ہی کو لیجئے، موجودہ دور میں مکہ مکرمہ سے کسی نماز کا سمعی و بصری مشاہدہ ناممکن نہیں۔ اب جب تمام ممالک میں میڈیا پر مکہ مکرمہ کی ظہر کی اذان کانوں سے سُنی جائے اور آنکھوں سے ادائیگی صلوٰۃ کا مشاہدہ کیا جائے تو دیگر ممالک میں ظہر کا مکہ مکرمہ سے گھنٹوں کی تاخیر سے ادا کرنا یہ بھی شاید صاحبِ مضمون کی نگاہ میں وحدت امت میں ایک بڑا رخنہ ہوگا۔ یہاں گو کسی ملک میں عشاء کا وقت کیوں نہ ہو، وہاں مکہ مکرمہ کے ساتھ اتحاد کا مظاہرہ کرتے ہُوئے لوگوں کو ظہر کی نماز پڑھ ہی لینی چاہیئے۔ اسی طرح روزے کو بھی اگر موصوف کے افکار کے آئینے میں دیکھا جائے تو اس میں بھی اُمت خاصے افتراق و تشتت میں مبتلا دکھائی دیتی ہے۔ کہیں آٹھ گھنٹے کا روزہ ہے تو کہیں یہ عبادت سولہ گھنٹے تک طویل ہو جاتی ہے۔ ممکن ہے اس میں مکہ مکرمہ کے ساتھ ہم آہنگی سے کچھ رعایت مل جائے۔

یہاں تک ہم نے موصوف کے دوسرے اور تیسرے مقدمے پر بحث کی ہے، لیکن ہمیں موصوف کے پہلے مقدمے "یوم النحر یوم العرفہ کے فوراً بعد کا اگلا دن ہے" پر ان کی کسی شرعی دلیل کا انتظار ضرور رہے گا۔ معلوم نہیں موصوف اپنی اس ذمہ داری سے کب عہدہ برآ ہوں۔

اب ہم اولوالالباب کے نقطۂ نظر کو بھی سامنے لاتے ہیں جو اختلاف لیل و نہار میں اللہ کی آیات کا مشاہدہ کرتے ہیں اور اسی اختلاف میں اللہ کی وحدانیت کا نظارہ کرتے ہیں اس اختلاف کو ایک وحدت کی لڑی میں پروئے بیٹھے ہیں۔ ایک ہی شئے کا عکس مختلف آئینوں میں آجانے سے اس شے کی حقیقی وحدت ان کی نظروں سے اوجھل نہیں ہوتی اور وہ ایک کو دو دیکھنے کے مرض سے محفوظ و مامون ہیں، چونکہ ان کی آفاقی نظر پورے عالم پر ہوتی ہے، اس لیے وہ عالم کی اشیاء میں اختلاف کو ناگزیر سمجھتے ہُوئے اسی اختلاف کے سمندر سے وحدت کے موتی بہر حال تلاش کر لیتے ہیں اور یہ جزئیات کو کلیات کی طرف لوٹانا ہے۔

نامناسب نہ ہوگا اگر ہم ان کے نقطۂ نظر سے موصوف کے نظریۂ وحدت کا تقابل پیش کریں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام اپنے اندر بڑے ہی اسرار و رموز لیے ہُوئے ہیں جن تک انسان کی

کمزور عقل کی رسائی بسا اوقات نہیں ہوتی۔ لیکن جو لوگ سمعنا واطعنا کے مصداق بن کر ان احکام پر لبیک کہتے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنے علم بیکراں سے ان پر ان اسرار و رموز کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔

اب آپ نمازوں کے اوقات ہی کو لیجئے دنیا کے مختلف مناطق میں غروب شمس کو مغرب کی نماز کے لیے نقطہ وحدت بنایا گیا ہے، اگرچہ اس وحدت پر عمل کے لیے اختلاف مقامات کی بناء پر تقدیم و تاخیر کا اختلاف ناگزیر ہے، اب اگر یہاں پر موصوف کے نقطۂ وحدت کو اپنایا جائے یعنی ان کے اوقات کو مکہ مکرمہ کے اوقات کے ساتھ سیٹ کیا جاتا ہے تو عین ممکن بلکہ امر واقعی ہوگا کہ بعض ممالک میں لوگ عین دوپہر کے وقت فجر کی نماز ادا کر رہے ہوں اور بعض ممالک میں عین دوپہر ہی کے وقت نمازِ عشاء ادا کر کے اللہ کی رسّی کو مضبوطی کے ساتھ تھامے کھڑے ہوں۔ اسی طرح افطار روزہ میں غروب شمس کو نقطۂ وحدت قرار دیا گیا ہے اور سحری کے لیے صبح صادق یا فلکیات کی اصطلاح میں سورج کے دائرۂ افق سے ایک خاص درجے تک شرقی انحطاط کو نقطۂ وحدت تسلیم کیا گیا ہے۔

اگرچہ اس میں بھی مختلف ممالک کے اعتبار سے تقدیم و تاخیر ناگزیر ہے تاہم ظاہر ہے اس اختلاف سے وہ اساسی وحدت مجروح نہیں ہوتی۔ موصوف کے نقطۂ وحدت کو اپنانے پر بعض ممالک میں لوگ عین سُورج کے غروب ہوتے وقت سحری کر رہے ہوں گے اور بعض ممالک میں سحری کے وقت شاید روزہ افطار کر کے ام القریٰ کے ساتھ وحدت کا ثبوت پیش کر رہے ہوں۔

نماز پڑھتے وقت بیت اللہ کو نقطۂ وحدت ٹھہرایا گیا ہے۔ اگرچہ مناطق کے اعتبار سے اختلاف جہات ناگزیر ہے۔ شرقی ممالک میں نماز پڑھنے والے کا رُخ مغرب کی طرف ہوتا ہے تو غربی ممالک میں اس کا رُخ مشرق کی طرف ہوگا۔

اینما تولوا فثم وجہ اللہ

ظاہر ہے اس سے وہ بنیادی وحدت جسے ہم ذکر کر آئے ہیں، متاثر نہ ہوگی، عمل ہر کسی کا اپنا اپنا ہوگا، لیکن کعبہ کی مرکزی وحدت پر سب جمع ہوں گے۔

اسی طرح اگر بغور دیکھا جائے تو عید الاضحیٰ اور عید الفطر کے منانے میں بھی اُمّت کے درمیان بنیادی وحدت موجود ہے، وہ یہ کہ عید الفطر یکم شوّال المکرم کو منائی جائے اور عید الاضحیٰ دس ذوالحجہ کو اور ہر ایک مُلک کی یکم شوال اور دس ذوالحجہ اپنے اپنے مطالع کے مطابق ہوگی۔

زمین، آسمان کی تخلیق میں فکر کرنے والے اولوالالباب کے لیے تو مختلف ممالک میں نماز جو کہ دن میں پانچ مرتبہ فرض ہے، اس کے اوقات میں مکّہ مکرمہ کے وقت سے گھنٹوں کی تاخیر سے وحدت کی بنیادی اساس پر کوئی زد نہیں پڑتی تو وہ عبادت جو سال بعد آتی ہے وہ اگر مکّہ مکرمہ سے دو دن مؤخر ہو جائے تو اس میں کوئی بوالعجبی نہیں۔ ہاں ممکن ہے موصوف کے لیے نمازوں کے اوقات کا اختلاف کسی تضحیک و تفضیح کا باعث بنے۔

موصوف ایک جگہ رقمطراز ہیں:

"ہزار شکر ہے کہ حج کی تاریخ کا تعیّن ان حضرات کے دائرہ کار و اختیار سے باہر ہے نہیں تو یہ حج ایک دن نہ ہونے دیتے، ہمیشہ خلقِ خدا کو مخمصے میں مبتلا رکھتے۔ ہر مُلک مناسکِ حج الگ الگ ادا کر رہا ہوتا ... اور یوں حج کی اصل غرض و غایت کو کبھی کا ہوا برد کر چکا ہوتا۔"

موصوف کی اس عبارت سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کے مدنظر یہ بات نہیں رہی کہ یوم عرفہ کی مخصوص عبادت (وقوف عرفہ) کے لیے وقت کے ساتھ جگہ بھی متعین ہے اور وہ جگہ ایک ہی ہے .... اگر ایسا نہ ہوتا اور عید کی نماز کی طرح وقوف کے مقامات بھی دُنیا میں مختلف ہوتے تو شرعی نقطہ سے اس میں بھی اختلاف ناگزیر تھا۔ پھر معلوم نہیں صاحب موصوف کس طرح خدا کا شکر ادا کرتے جو وہ اب کر رہے ہیں۔

ہماری ان معروضات کو موصوف اپنے بیان کا رد نہ سمجھیں، انہیں صرف ایک تبصرہ سمجھا جائے۔ ممکن ہے کہ ہمارے ان خیالات کو موصوف اپنے نقطۂ وحدت سے تطبیق دینے کیلئے کچھ اور افکار عزیبہ پیش کریں، اس پر ہم ان کے مزید شکر گزار ہوں گے۔

مراد ما نصیحت بود و کردیم

حضرۃ مولانا ظفیرالدین

معصیت اور اُسکے اثرات

اللہ تعالیٰ کی نافرمانی اور اسکے احکام سے روگردانی کائناتِ انسانی کا سب سے بڑا جرم ہے اور ہر شخص جانتا ہے کہ مجرم سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ ہمارا عقیدہ ہے کہ ہمارا کوئی عمل اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس کے لکھنے والے ہر وقت اپنا دفتر مرتب کر رہے ہیں۔ ربّ العزّت کے فرشتے دن رات ہمارے ساتھ لگے ہیں اور ہم جو کچھ کرتے رہتے ہیں، وہ ان کو برابر لکھ رہے ہیں اور وہی لکھتے ہیں جو ہم کرتے ہیں، کوئی کمی بیشی وہ اپنی طرف سے ہرگز نہیں کرتے۔ قیامت کا دِن جو بدلے کا دِن ہے، ساری رُوداد عمل سامنے پیش کی جائے گی۔ ان جرائم کی سزا انسان کو صرف آخرت میں ہی نہیں ملے گی بلکہ قرآن وحدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آخرت سے پہلے بھی گناہوں کی سزا مل سکتی ہے۔

دُنیا کے اندر آئے دن جو فتنے فساد برپا ہوتے رہتے ہیں اور دن رات جیسے کچھ فساد اور مصائب کی بوچھاڑیں آتی رہتی ہیں یہ سب کی سب انسانی اعمال کی ہی پاداش میں ہُوا کرتی ہیں، انسان کے اعمال اور اخلاق میں اگر انقلاب نہ ہوتا اور وہ اطاعت وعبادت کی راہ سے نہ ہٹتا تو شاید موجودہ مصائب کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔

ارشادِ باری ہے:

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ

لوگوں کے ہاتھوں کی کمائی کے نتیجہ میں خشکی اور تری میں فساد پھیل پڑا۔

کُفر وشرک، عصیان وطغیان اور اعمال واخلاق کی پستی کی وجہ سے فتنہ وفساد کے چشمے اُبل پڑے۔ مُلکوں اور جزیروں میں خرابی پھیل گئی، دُنیا کا امن وسکون ناپید ہوگیا، خشکی سے لے کر سمندروں تک میں جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے۔ مار پیٹ، کاٹ مار اور قتل وخونریزی سے کوئی چپّہ محفوظ نہ رہ سکا اور یہ جو کچھ ہے سب ہماری بداعمالیوں کی سزا کا ادنیٰ نمونہ ہے، پوری سزا

تو آخرت میں ملے گی اور یہ نمونہ صرف اس لیے دکھایا گیا ہے کہ ممکن ہے کچھ لوگ یہ دیکھ کر ڈریں اور عبرت و بصیرت حاصل کریں۔ دوسری آیت ہے:

وَمَا اَصَابَكُمْ مِنْ مُصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ (شوریٰ ۴۴) جو تم پر مصیبت پڑی وہ تمہارے ہاتھوں کی کمائی کا بدلہ ہے اور وہ بہت سے گناہوں کو معاف کر دیتا ہے۔

یعنی انسان مصیبتوں اور آفتوں کے جن طوفانوں سے ہو کر گزر رہے ہیں، ان کے اسباب خود ان کے ہاتھوں نے فراہم کیے ہیں اور موجودہ مصائب کی وجہ خود ان کے بُرے اعمال و اخلاق ہیں اور پھر رحمتِ الٰہی نے ترس کھایا ہے ورنہ معلوم نہیں کیا حال ہوتا۔ بہت سے گناہوں سے تو درگزر فرمایا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے یہ مسئلہ بھی صاف طور پر بیان کر دیا ہے کہ وہ نعمت کی جگہ زحمت کب پیدا کرتا ہے اور انعام و اکرام کی نوازش کب بند کر دیتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

ذَالِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ۔

اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ اس نعمت کو جو کسی قوم کو دی تھی ہرگز بدلنے والا نہیں ہے جب تک وہی اپنے جیون کی بات بدل نہ ڈالیں اور یہ کہ اللہ سننے والا ہے۔

معلوم ہوا کہ پہلے انسان کی نیت و اعتقاد اور اس کے اعمال و اخلاق میں بے اعتدالی پیدا ہوتی ہے اور یوں رفتہ رفتہ اس کے فطری استعداد اور صلاحیت میں انقلاب آتا ہے تو کہیں جا کر احکم الحاکمین نعمتوں کو سلب کرتا ہے اور انعام و اکرام کی جگہ شانِ انتقام پیدا کرتا ہے۔

ایک جگہ ارشاد ہے:

وضرب اللّٰه مثلا قرية كانت اٰمنة مطمئنة يأتيها رزقها رغدا من كل مكان فكفرت بانعم اللّٰه فاذاقها اللّٰه لباس الجوع والخوف بما كانوا يصنعون

اللہ نے ایک مثال بتلائی کہ ایسی بستی چین اور امن سے تھی، ہر جگہ سے اس کو

فراغت کی روزی چلی آتی تھی، پھر اس نے اللہ کے احسانوں کی ناشکری کی تو اللہ نے اس کو مزہ چکھایا کہ بھوک اور ڈر اس کے بدن کے کپڑے ہو گئے۔ یہ اس کا بدلہ ہے جو وہ کرتے تھے۔ (نحل:۱۵)

یہ قرآن کی مثال کتنی واضح ہے اور ربّ العزّت نے کتنا عمدہ نقشہ کھینچا ہے، جو دلیل ہے کہ انسانوں پر مصائب اور طرح طرح کے عذاب و شدائد اس وقت آتے ہیں جب خود بھی کفرانِ نعمت اور ناشکری پر اُتر آتا ہے۔

ان ساری آیتوں کے پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا میں جتنے مصائب و شدائد اور جس طرح کے عذاب و آفت کا نزول ہوتا ہے وہ انسان کے اعمال و اخلاق اور نیت و اعتقاد کے فتور اور کمزوری کا نتیجہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یُوں کہیئے کہ اطاعت و عبادت سے روگردانی اور معصیت کے ارتکاب کے اثرات ہیں جو آئے دن ہمیں زندگی میں پیش آتے رہتے ہیں، نیز اس وقت یہ بھی ثابت کرنا ہے کہ ہم جو کچھ کرتے ہیں اس کا بدلہ ہمیں کسی نہ کسی شکل میں ضرور ملا کرتا ہے اور یہ بدلہ دُنیا میں بھی مِلتا ہے اور آخرت میں بھی، پھر دُنیا میں جو کچھ اعمالِ بد کے نتائج پیش آتے ہیں ان کا بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ہم انسان اپنے بُرے اعمال و اخلاق اور نیّات و اعتقادات کا یہ پھل چکھ کر اپنے بُرے کاموں سے باز آجائیں اور اصلاح حال کی پوری کوشش کریں۔

یہ اصولِ قرآنی جب سمجھ میں آگیا تو اب آیئے معصیت کے اثرات ملاحظہ فرمائیے کہ دُنیا میں اس کا کیا اثر پڑتا ہے۔ "حافظ ابن القیم" نے اپنی کتاب "الجواب الکافی" میں معاصی کے نقصانات بڑی تفصیل سے بیان کیے ہیں، ان میں سے چند کا تذکرہ کیا جاتا ہے:

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وسلّم کا گزر ایک دفعہ "دیارِ ثمود" سے ہُوا تو آپؐ نے صحابۂ کرامؓ میں اعلان فرمادیا کہ: "اللہ تعالیٰ کے عذاب کو یاد کر کے روتے ہُوئے چلو، اور خبردار اس دیار کا پانی تک استعمال نہ کرو۔" حتّٰی کہ یہاں کے پانی سے جو آٹا گوندھا گیا تھا اس کے متعلق فرمایا کہ: "خبردار اسے اُونٹ کو بھی نہ کھلاؤ۔"

حدیث کا یہ واقعہ بتاتا ہے کہ معصیت اور نافرمانی کی وجہ سے جو اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل ہوتا ہے اس عذاب کا اثر وہاں کی ہر ہر چیز میں ہو جاتا ہے۔ پانی جیسی عام منفعت کی چیز بھی عذاب کے

اثر سے نہیں بچا کرتی۔

اُوپر کے واقعہ میں جس طرح آپ نے پڑھا کہ پانی میں عتاب و عذابِ الٰہی کا اثر ہوتا ہے اسی طرح کبھی ایسا ہوتا ہے کہ معصیت کا اثر، پھل، میوہ اور غلّہ پر بھی پڑا کرتا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی ہر طرح کی برکت جاتی رہتی ہے، پیداوار میں خاصی کمی ہو جاتی ہے۔ آسمانی آفات کا نزول ہوتا جس سے ساری فصل برباد ہو جاتی ہے، کبھی قحط پڑتا ہے جس سے کھیتی جل جاتی ہے، کبھی سیلاب آتا ہے جس سے فصل تہ آب ہو جاتی ہے اور انسانوں میں "بھوک بھوک" کی پکار ہوتی ہے، جس کا اشارہ اُوپر کی آیتوں میں گزر چکا ہے اور تو اور حدیث ہے کہ مصیبت اور گناہ کا اثر ظاہری شکل و جسامت پر بھی پڑتا ہے، جس سے پھل چھوٹے ہو جاتے ہیں، غلوں کے دانہ کی جسامت میں کمی آجاتی ہے، اور یہ کوئی افسانہ نہیں واقعہ ہے۔ "امام احمدؒ" نے اپنی مسند میں ایک حدیث کے ضمن میں تحریر فرمایا ہے کہ: "بعض بنو امیہ کے خزانہ میں ایک گیہوں کا دانہ میں نے پایا جو کھجور کی گٹھلی کے برابر تھا اور وہ ایک تھیلے میں بحفاظت رکھا ہوا تھا جس پر یہ لکھا تھا کہ "یہ عدل کے زمانہ کی پیداوار ہے"۔ (الجواب الکافی ص۸۵)

یہ بیان کس قدر ذمہ دار بزرگ کا ہے؟ پس اسکے بعد کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ معلوم ہوا، احکامِ خداوندی سے رُوگردانی آفتوں کا پیش خیمہ ہے۔ عدل و انصاف کی جگہ جب جور و ظلم نے لی تو قدرت کی طرف سے برکت اُٹھالی گئی۔ آجکل کے گیہوں کے دانے اور عدل و انصاف کے زمانہ کے گیہوں میں باعتبار جسامت کتنا عظیم الشان فرق رونما ہو گیا ہے۔ "حافظ ابن القیمؒ" نے "شیوخ صحرا" کی روایت سے بیان کیا ہے کہ پھلوں کی جسامت میں نسبتاً بڑا فرق پیدا ہو گیا ہے۔ پہلے بہت بڑے پھل ہُوا کرتے تھے (حتیٰ کہ پھلوں وغیرہ کا ذائقہ تک گناہوں کے اثرات سے محفوظ نہیں رہا)

آج کل جو لوگ بوڑھے اور بڑی عمر کے رہ گئے ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ نصف صدی پہلے انار وغیرہ پھلوں میں باعتبار جسامت کافی فرق آگیا ہے، جتنے بڑے پھل کے دانے پہلے ہوتے تھے اب باقی نہیں رہے، باقی پیداوار کی قلّت، تو یہ مسئلہ اس قدر عیاں ہے کہ دلیل کی ضرورت ہی نہیں، کسان کے بچے بچے کی زبان سے سُن لیجئے کہ پیداوار پہلے کی نسبت برائے نام رہ گئی ہے

اور ہر سال کمی ہی واقع ہوتی جا رہی ہے۔

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ "ظلم و جور اور فسق و فجور کا اثر ہے کہ پھلوں کی جسامت مختصر ہو گئی، اور جب کبھی رُوئے زمین مصیبت اور نافرمانی کی گندگیوں سے پاک ہو گی، ساری برکتیں عود کر آئیں گی۔"

ترمذی شریف میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے جس کا مفہوم یوں ہے:

(قیامت کے قریب زمانے میں) جب اللہ تعالیٰ زمین کو ظلم، خیانت اور بدکاری سے پاک کرنا چاہے گا تو اہلبیتِ نبیؐ میں سے اپنے ایک بندہ سے کام لے گا، وہ زمین کو انصاف سے بھر دے گا۔ یہود و نصاریٰ قتل ہوں گے اور دین صحیح رنگ میں جاری ہو گا۔ (ایسے میں) زمین پھر برکتوں سے مالا مال ہو گی، حتّٰی کہ ایک انار پوری جماعت کے لیے کافی ہو گا اور انگور کا ایک گچھا اتنا وزنی ہو گا جتنا وزنی اُونٹ اُٹھا سکتا ہے۔ اسی طرح ایک اونٹنی کا دُودھ ایک جماعت کو کافی ہو گا۔

معلوم ہُوا ظالموں کا ظُلم، خائنوں کی خیانت اور بدکاروں کی بدی نے زمین سے برکتوں کو فنا کر دیا ہے اور پھر اس وقت تک زمین کی یہ برکت لَوٹ کر نہ آئے گی جب تک رُوئے زمین ان گندگیوں سے پاک نہ کر دی جائے اور عدل و انصاف، اطاعت و عبادت اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی کارفرمائی نہ ہو۔

انسان جب احکامِ الٰہی کی پابندی نہیں کرتا عبادت و اطاعت کا حق ادا نہیں کرتا اور مشکوٰۃ نبوّت کی روشنی پاتے ہُوئے راہِ راست سے بھٹک جائے تو بہت سی نعمتوں کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور لعنت و عذاب کی بارش اُمنڈ اُمنڈ کر برسنے لگ جاتی ہے۔

حدیثِ قدسی میں ارشادِ باری ہے: "میرے عزّت و جلال کی قسم، کوئی بندہ جب اس کام کو چھوڑ کر جس کو مَیں پسند کرتا ہُوں ایسے میں لگ جاتا ہے جو مجھے پسند نہیں تو مَیں بھی اس کے محبوب کام کو بند کر دیتا ہُوں اور ناگوارِ خاطر کا دروازہ کھول دیتا ہوں۔"

معلوم ہُوا کہ جب طاعت کی جگہ معصیت، شُکر کے بجائے ناشُکری اور رضا طلبی کے مقام میں باعثِ غضب امور انجام دیئے جاتے ہیں تو ربّ العزّت بھی انعام و اکرام کی جگہ انتقام

رحمت کی جگہ زحمت اور عافیت کی جگہ عقوبت کا منظر دکھاتا ہے، اور شوکت و عزّت دیکھتے ہی دیکھتے ذلّت و مسکنت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ یہ ہر شخص کو یقین کر لینا چاہیئے کہ دُنیا کی اکثر و بیشتر مصیبتیں گناہ اور اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی سے سرتابی کا نتیجہ ہیں، سچ فرمایا حضرت علیؓ نے :

ما نزل بلاء الا بذنب ولا رفع بلاء الا بتوبة (الجواب الکافی ص۹۷)

جو بھی بلا نازل ہوتی ہے اس کا سبب گناہ ہے اور یہ بلا صرف توبہ سے دُور ہوتی ہے۔

انسان اگر اس رمز کو یقین کے ساتھ سمجھ لیں تو وہ بہت ساری آفتوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہو جائیں، مگر افسوس صد افسوس وہ سارا فلسفہ سمجھ لیتے ہیں لیکن اس معاملہ میں اس کی نگاہ بہت کوتاہ ہوتی ہے، جس کا نتیجہ ہے کہ وہ اس بنیادی اسباب و علل تک نہیں پہنچ پاتا ہے، موجودہ خوف و ہراس جس کا گھر گھر چرچا ہے کس کی پیداوار ہے، یہ سب معصیت اور کفرانِ نعمت ہی کے پیٹ سے پیدا ہُوئے ہیں، قلّت و کثرت کا مسئلہ ایک موہوم مسئلہ ہے، اگر اس کی کوئی حقیقت ہوتی تو اوائل اسلام میں جو کچھ دینِ اسلام کے پیروکاروں کو ترقی ہوئی شاید نہ ہوتی، واقعہ یہ ہے کہ بندہ جب خدا سے غافل ہو جاتا ہے، اس کی نافرمانی کو اپنا شعار بنا لیتا ہے اور اس کی اطاعت و عبادت سے منہ موڑ لیتا ہے تو قدرت کی طرف سے اس کی سزا یہ ہوتی ہے کہ خوف و ہراس اس کے دِل میں گھر کر لیتا ہے، جہاں کوئی پتہ کھڑکھڑایا، اس کے چہرے کا رنگ فق ہو گیا، اطمینان و سکون جاتا رہا اور راہِ فرار کی فکر دامن گیر ہو گئی۔ قرآن نے کتنی سچّی حقیقت کا اعلان کیا : اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ "

وجہ معلوم ہے کہ طاعتِ الٰہی اور اس کی رضا ایک عظیم الشّان قلعہ ہے، جو اس میں داخل ہُوا وہ ہر آفت اور تمام خوف و ہراس سے مطمئن ہو گیا، نہ دُنیا اور اس کے مصائب کا خطرہ رہا اور نہ آخرت اور اس کے عذابِ الیم کا غم۔ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ارشاد باری تعالیٰ ہے تاریخ بھی شاہد ہے اور موجودہ دَور میں بھی ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ قتل خونریزی کے اوقات میں بھی فرمانبردار بندوں کے قدم نہ ڈگمگائے اور آگ اور خون کی بارش بھی ان کی ثباتِ قدمی میں لغزش پیدا نہ کر سکی، مگر جونہی وہ دینی قلعہ سے باہر آئے سارا امن و امان خوف و ہراس سے بدل گیا۔ سچ تو یہ ہے کہ جو ربّ العزّت کا ہو گیا اور اس سے ڈرا، ساری

چیزیں اس کی فرمانبردار ہوگئیں اور اس کو تمام خوف وہراس سے امن وسکون نصیب ہوگیا اور جس نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور اس سے نہیں ڈرا، تمام مخلوق کے خوف میں گھر گیا اور سکون و اطمینان کھو دیا جس کا وحشتناک منظر کبھی یہ دیکھنے میں آیا ہوگا کہ معاصی وذنوب میں ڈوبا ہُوا، متوحش اور پریشان حال ہے اس کا قلب وحشت کی وادی میں جاں بلب ہے۔ یہ وحشت بھی اس کے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان حائل نظر آئے گی کبھی اس کے اور مخلوق کے باہم کارفرما ہوگی اور کبھی وہ خود اپنی ذات سے وحشت محسوس کرتا ہوگا، اور معصیت کی کثرت اور اس کے اشتداد کے ساتھ وحشت کی شدّت بھی ترقی پذیر ہوگی، عقلمند وہ ہے جو ان حالات پر گہری نظر رکھے۔

یہاں بھی بات وہی ہے کہ طاعت ربّ العزّت کی قربت اور نزدیکی کا ذریعہ ہے، اور قربت سے اُنس ومحبت پیدا ہُوا کرتی ہے، اور معصیت خدا سے دُوری اور بُعد کو چاہتی ہے اور جُوں جُوں دُوری بڑھتی جائے گی، وحشت پیدا ہوتی جائے گی، دُنیا میں دیکھا گیا ہے کہ اغیار اور اعداء سے وحشت ہوتی ہے اور اقرباء واحباب سے اُنسیت ومحبت۔

اور یہی وجہ ہے گنہگار، اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں معتوب ومردُود ہوتا ہے اور اس کی نظر میں حقیر وبے قیمت، کیونکہ گناہ کر کے اس نے اپنے کو خدا سے دُور کر لیا ہے اور اس کی عدول حُکمی کے جُرم میں اس سے عزّت ومکرمت چھین لی گئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ مخلوق کی نگاہ میں گر گیا ہے اور شریفوں کی محبت سے محروم ہے نہ کوئی اس کی عزّت وتوقیر کرتا ہے اور نہ کوئی اسے اچھی نظر سے دیکھتا ہے، سب کے دِلوں میں اس کی طرف سے نفرت جاگزیں ہوچکی ہے، ابھی منہ پر تو کوئی رعب ودبدبہ کی وجہ سے بُرا نہیں کہتا مگر دِل سب کا ہی پھرا ہُوا ہے، بدکار، بدکردار، بداخلاق، بدمعاملہ اور بُرے اعتقاد والے کو جس ذلّت آمیز طریقہ پر ہم میں یاد کیا جاتا ہے وہ ہم سب کو معلوم ہے چور، ڈاکو، سُودخور، مہاجن وظالم اور غیر منصف حکّام عوام میں کیسی زندگی گزارتے ہیں یہ کس کو معلوم نہیں؟ اور صحیح عزّت ووقعت مِل بھی کیسے سکتی ہے یہ تو نیک لوگوں کا حصہ ہے، قرآن کا تو فیصلہ ہے:

ومن یھن اللہ فما لہ من مکرم (حج: ۲)

جس کو اللہ ذلیل کرے اس کو کوئی عزت دینے والا نہیں ہے

باقی صفحہ پر

الجامعة المدنيّة

و

مؤسّسها المُحترم

بقلم الأستاذ العلّام مولينا عبد المنّان الدهلوی رحمہ اللہ

جَزَاكَ رَبُّكَ قَدْ هَيَّجْتَ لِي شَجَنًا   يَا مَنْ يَّلُومُ فِيمَنْ يُّخْجِلُ الْقَمَرَا

اے ملامت گر! خدا تجھے جزا دے، تُو نے (مجھے) چاند کو شرما دینے والے محبوب (مولانا سیّد حامد میاں) کے بارے میں ملامت کر کے میرے (دیرینہ) غم کو اُبھارا

يَا لَذَّتِي وَقَرَارُ الرُّوحِ مُرْتَبِطٌ   بِمَنْ يُّحِبُّ حَبِيبًا فَاجْتَنَى ثَمَرَا

میری رُوح کا قرار و لذت ایسی ذاتِ ستودہ صفات (مولانا حامد میاںؒ) سے وابستہ ہے جس کا تعلق ایسے شیخ وقت (حضرت مدنیؒ) سے ہے جن کی صحبت سے وہ خوب بہرور ہُوا

بِذِكْرِ حَامِدِنَا الْمَيْمُونِ طَائِرُهُ   بَدْءُ الْقَصِيدَةِ مِنْ تَشْبِيبِهَا نَدِرَا

خوش بخت (مولانا) حامد میاںؒ کے ذکر سے قصیدے کا آغاز ہُوا جس کی تشبیب نُدرت لیے ہُوئے ہے

سَعَى لِخِدْمَةِ دِينِ اللهِ مُنْهَمِكًا   فِي رَفْعِهِ لِيَنَالَ الْأَجْرَ مُدَّخَرَا

اللہ کے دین کی خدمت و سربلندی کے لیے انہماک کے ساتھ کوشاں ہیں تاکہ (اللہ تعالیٰ کے یہاں) ذخیرہ شدہ اجر پا سکیں

بَنَى وَوَفَّقَهُ الْخَيْرَاتِ جَامِعَةً   مَدَنِيَّةً يَا لَهَا صِيتًا وَقَدْ نَشَرَا

خدا نے انھیں توفیق دی، انھوں نے جامعۂ مدنیّہ بنایا اور علوم پھیلائے۔ (اُن کا جامعہ مدنیّہ) کیا ہی شہرت یافتہ مدرسہ ہے

رَاقَتْ بِمِيزَتِهَا فَاقَتْ بِحِكْمَتِهَا   عَلَى الْمَدَارِسِ قَدْ بَيَّنْتُ مُخْتَصَرَا

(یہ جامعہ مدنیّہ) اپنے فضائل میں خوش منظر ہے۔ اپنی حکمت و علم میں دیگر مدارس پر فوقیت رکھتا ہے۔ بس مَیں نے مختصر حال بتا دیا

لِلّٰهِ دَرُّ ذَوِي فَهْمٍ اَسَاتِذَةٍ   حَازُوا الْوَلَايَةَ وَالطَّاعَاتِ وَالْغُرَرَا

کیا ہی عمدہ اور سمجھ دار اساتذہ ہیں (جامعہ کے) جنھوں نے ولایت اور اطاعتِ حق اور پُر نور چہرے پائے ہیں

رَئِيسُهَا مُسْتَشَارُ الْأَمْرِ مُؤْتَمَنًا   مُؤَيَّدًا مِّنْ جَنَابِ الْقُدْسِ مُؤْتَمِرَا

اس کے صدر مشوروں میں دیانتدار اطاعت گزار اور بارگاہِ قدسی سے مؤیّد تھے

اَحْمَدْ عَلِي مِنْ خِيَارِ النَّاسِ مَرْتَبَةً   وَرِفْعَةً وَّذَكَاءً عُدَّ مُعْتَبَرَا

(وہ حضرت مولانا) احمد علیؒ تھے، جن کا مرتبہ لوگوں میں سب سے بہتر اور بلندئ فکر و ذکاوت میں معتبر اور مُسلّم ہیں

وَجَدْتُهٗ كَلِفًا بِالْبَيْتِ مُعْتَمِرًا وَبِالْمَطَافِ طَوَافًا قَبَّلَ الْحَجَرَا

میں نے انھیں بیت اللہ کی محبت میں بے چین اور عمرے کرنیوالا پایا اور طواف کرنے میں مطاف سے محبت تھی، انھوں نے حجر اسود کے بار بار بوسے لیے

اَمِيْرُ قَافِلَةٍ تَبْقٰى مَآثِرُهَا اِلَى الْقِيَامَةِ اِحْصَاءً وَّمُسْتَطَرَا

وہ ایسے قافلہ کے سالار تھے جن کے فضائل قیامت تک شمار کیے جاتے رہیں گے اور لکھے جاتے رہیں گے

تَحِيَّةٌ كَعِدَادِ الرَّمْلِ نَازِلَةٌ عَلَيْهِ دَآئِمَةً كَالْمِسْكِ طِيْبَ ثَرٰى

ریت کے ذرات کی تعداد میں ان پر خداوند کریم رحمت نازل فرمائے جو مسلسل قائم رہے (اور) مشک جیسی عمدہ مٹی (انھیں نصیب ہو)

هَا تَحْتَ اِشْرَافِهٖ تَرْقٰى اِلٰى فَلَكِ الْعُلٰى وَتَعْلُوْا بِمَا فِيْهَا وَمَا ظَهَرَا

دیکھو! ان کی سرپرستی میں (یہ جامعہ) فلک اعلیٰ تک ترقی کر رہا ہے اور ظاہری و باطنی بلندی حاصل کر رہا ہے

وَبَعْدَهٗ قَامَ مُهْتَمًّا سُلَالَتُهٗ بِالنَّظْمِ مُشْتَغِلًا بِالرَّأْيِ مُخْتَفِرَا

ان (حضرت شیخ التفسیرؒ) کے بعد انکے صاحبزادے (مولانا عبید اللہ انورؒ) اپنی رائے سے دین کی حمایت کرتے ہوئے اس (جامعہ) کے نظم و نسق میں اہتمام سے مشغول ہوئے

بِصِدْقِ نِيَّتِهٖ وَالنُّصْحُ زِيْنَتُهٗ يُعَلِّمُ الْغَافِلَ الْاٰدَابَ وَالسِّيَرَا

خلوص ان کی زینت ہے۔ وہ صدق دل سے غافل (مخلوق) کو آداب و سیرت کی تعلیم دیتے ہیں

مَحَبَّةً وَّخُلُوْصًا صَادَ اَفْئِدَةً خُذْ مِنْ مَّقَالَتِهٖ الْاَسْرَارَ وَالْعِبَرَا

ان کی محبت و خلوص نے دلوں کو شکار کر لیا ہے۔ ان کی گفتگو سے اسرار و عبرت کے سبق حاصل کرو

ضروری نوٹ

ہماری طرح قارئین کرام بھی زیر نظر رسالہ میں کئی طرح کی خامیاں محسوس کر رہے ہونگے جن میں ایک بڑی خامی "کتابت" کا بے ڈھنگا پن ہے۔ جس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے آج سے کئی ماہ پہلے ایک عمدہ کتابت کرنے والے سے معاملہ طے کر کے کتابت کے لیے مضامین اس کے سپرد کر دیئے تھے۔ مگر افسوس کہ اس نے معاہدہ کو نظر انداز کر کے اپنے بجائے نوآموز کاتبوں سے کتابت کرائی۔ اس پر مستزاد یہ کہ تھوڑے سے کام پر کئی ماہ لگا دیئے۔ بہرحال ہم کتابت کی اس خامی سمیت جملہ خامیوں کے ازالہ کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ اور انشاء اللہ تعالیٰ ایک دو اشاعتوں کے بعد قارئین کرام کو کوئی خاص شکایت نہ رہے گی۔